www.shibliinternational.com

February 2020 فروری

ISSN: 2581-9216

ماہنامہ صدائے شبلی حیدرآباد

Urdu Monthly SADA E SHIBLI Hyderabad

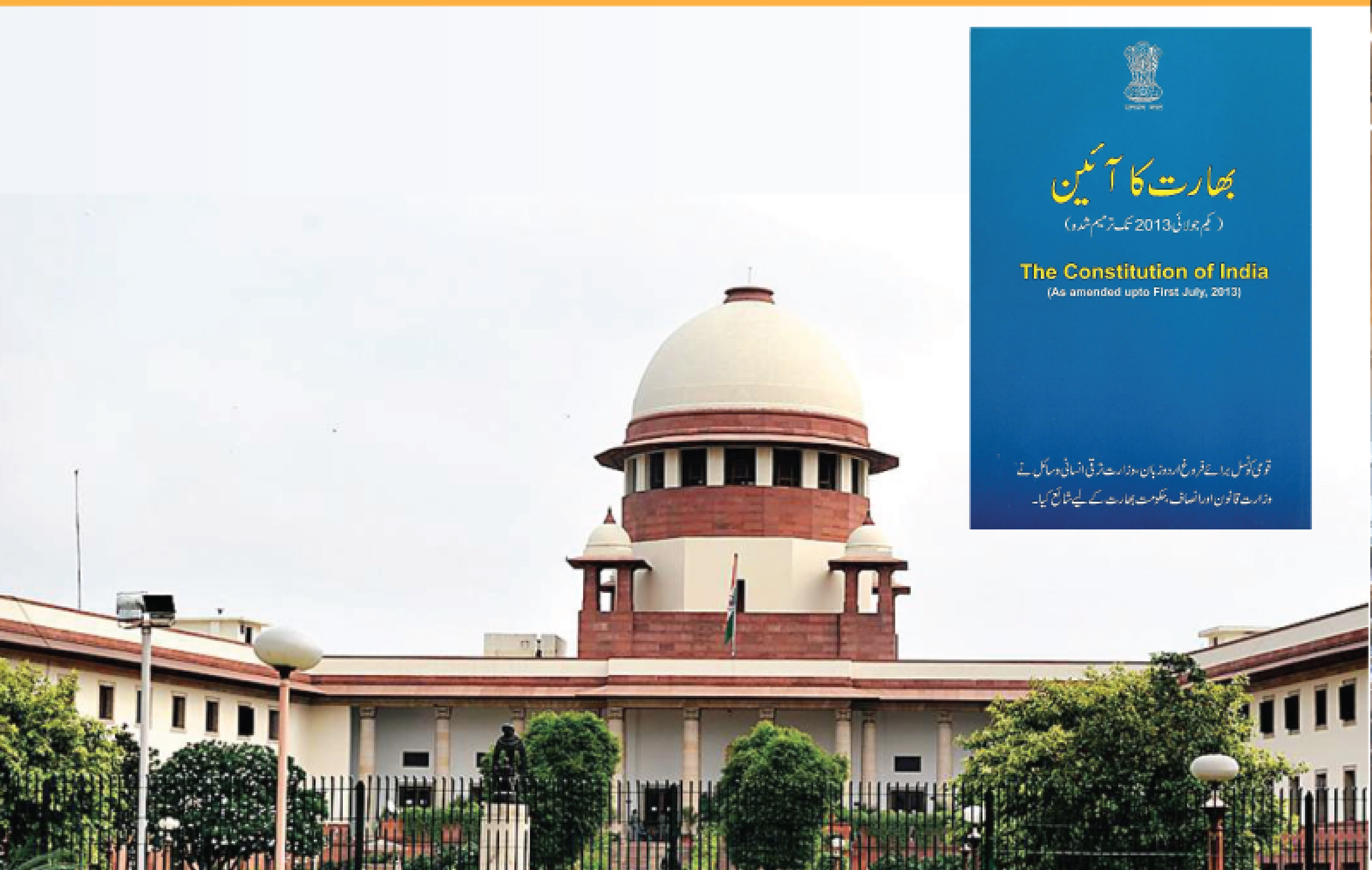

ایڈیٹر مولانا ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

-/20 روپے

فروری Feb :2020 | علمی، ادبی، سائنسی، مذہبی، سماجی اور معلوماتی شاہکار | جلد Vol2۔ شمارہ: Issue 24

ماہنامہ حیدرآباد

صدائے شبلی

مدیر: ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

نائب مدیران: ڈاکٹر سراج احمد انصاری ☆ ڈاکٹر عبدالقدوس ☆ ابوہریرہ یوسفی

مجلس مشاورت:

پروفیسر اشتیاق احمد ظلی، استاذ الاساتذہ حضرت رحمٰن جامی
پروفیسر مظفر علی شہہ میری، پروفیسر محسن عثمانی ندوی
پروفیسر ابوالکلام پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی
ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی، مولانا ارشاد الحق مدنی
مولانا محمد مساعد ہلال احیائی، اعجاز علی قریشی ایڈوکیٹ
محمد سلمان انجینئر

مجلس ادارت:

ڈاکٹر محمد رفیق، ڈاکٹر حمران احمد، ڈاکٹر جاوید کمال
ڈاکٹر ناظم علی، ڈاکٹر مختار احمد فردین، ڈاکٹر غوثیہ بانو
ڈاکٹر سمیہ تمکین، ڈاکٹر سید امام حبیب قادری، ڈاکٹر
فاروق احمد بھٹ، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، مولانا احمد نور عینی
ڈاکٹر مصلح الدین نظامی، ابوہریرہ ایوبی، محسن خان

Email: sadaeshibli@gmail.com

Mob: 9392533661- 8317692718

قیمت فی شمارہ: 20
سالانہ: 220 - بیرونی ممالک: 50 / امریکی ڈالر
خصوصی تعاون 1000

SADA E SHIBLI
A/c: 1327102000023922
IFSC CODE: IBKL0001327
IDBI BANK, CHARMINAR HYD, TS

ماہنامہ "صدائے شبلی" حیدرآباد میں مقالہ نگاران سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

ہر طرح کی قانونی چارہ جوئی صرف حیدرآباد کی عدالت میں ہوگی

محمد محامد ہلال (اونر، پبلشر، پرنٹر، ایڈیٹر) نے دائرہ الیکٹرک پریس میں چھپوا کر حیدرآباد تلنگانہ سے شائع کیا

خط و کتابت کا پتہ

MOHD MUHAMID HILAL #17-6-352, B1, 2nd Floor,Bafana Complex,
Near Asfya Masjid Dabirpura Road, Purani Haveli,Hyderabad- 500023. T.S

فہرست مضامین

۱	اپنی باتیں	ڈاکٹر محمد حامد ہلال اعظمی	۵
۲	اخلاقِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم	علامہ شبلی نعمانیؒ	۶
۳	دیباچوں میں ذکرِ شبلی کا مطالعہ (قسط:۲۱)	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	۷
۴	ایمان بالآخرت	مولانا صدرالدین اصلاحی	۱۱
۵	آئین ہند اور ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر	مولانا انصار احمد معروفی	۱۳
۶	شاہین باغ کے نام (نظم)	یوسف جمیل جامعی	۱۵
۷	سردار جعفری: ظہور ذات وصفات کا شاعر	ڈاکٹر مسعود جعفری	۱۶
۸	غزل	احمد علی برقی	۱۸
۹	عورت کا حقیقی مقام	ڈاکٹر نادر المسدوسی	۱۹
۱۰	غزل	محبوب خان اصغر	۲۰
۱۱	ڈاکٹر راہی فدائی کی نثری تصنیفات کا تحقیقی جائزہ	جی بی عائشہ	۲۱
۱۲	میر شخصیت وشاعری	عطیہ نفیس	۲۸
۱۳	نظم گجرات ۲۰۰۲ء	نیاز جیراج پوری	۳۱
۱۴	مولانا خاموش کریری رباعیات کے آئینے میں	منظور حسن گڈا	۳۲
۱۵	سی اے اے، این پی آر، این آر سی حقائق، خطرات، لائحہ عمل	احمد نور عینی	۳۵
۱۶	احساس (افسانہ)	سیدہ تبسم منظور	۳۹
۱۷	سائنسی قوس قزح	مبصر: ڈاکٹر مرزا محمد خضر	۴۱

ماہنامہ ”صدائے شبلی“ کے خصوصی معاونین

ابو سفیان اعظمی مقیم حال ممبئی...... الحاج **محمد منیرالدین عرف ولی**، آغا پورہ حیدرآباد
ڈاکٹر سید **جلیل حسین** ایم ڈی (علیگ) ٹولی چوکی حیدرآباد...... الحاج **محمد عبد الستار** سکھ ویلیج سکندرآباد حیدرآباد
علی میاں احمد پٹھان رائے گڑھ (مہاراشٹر)...... **علی احمد عبد اللہ** کونچالی، رائے گڑھ (مہاراشٹر)
الحاج **رئیس احمد اقبال** انجینئر، سکھ ویلیج سکندرآباد حیدرآباد...... **محمد عبدالماجد** ایڈوکیٹ، سکندرآباد، حیدرآباد
جناب قاضی **فیض الدین**، ایرتو ڑیل، مہاڈ، رائے گڑھ مہاراشٹرا۔ ڈاکٹر **شہباز احمد**، پروفیسر گورنمنٹ نظامیہ طبی کالج
چارمینار، حیدرآباد...... مولانا **محمد عبدالقادر سعود** نائس جوس سینٹر سکندرآباد، حیدرآباد۔
الحاج **محمد قمرالدین** نبیل کالونی بارکس حیدرآباد...... **محمد مسعود خان** سکھ ویلیج سکندرآباد حیدرآباد

اپنی بات

الحمدللہ ماہنامہ ''صدائے شبلی'' حیدرآباد کا چوبیسواں (۲۴) شمارہ اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ ادارہ اپنے دوسال کی تکمیل پر تمام قارئین، معاونین، محبین اور قلم کاروں کا شکریہ ادا کرتا ہے۔ ظاہر ہے آپ کے تعاون کے بغیر موجودہ دور میں رسائل وجرائد کو منظرعام پر لانا کارِ دشوار ہے۔ امید قوی ہے کہ آپ کا تعاون حسب سابق بلکہ اس سے بہتر انداز میں ادارے کے ساتھ جاری وساری رہے گا۔

دلّی ہندوستان کا دل ہے۔ ماہِ رواں کے پہلے دوسرے ہفتوں میں دلّی انتخابات منعقد کیے گئے اور اور ان کے متوقع نتائج سامنے آئے۔ سردی کے موسم میں الیکشن کی گرمی پورے عروج پر تھی۔ دلّی کے تخت پر پہنچنے کے لیے انسانیت اور اخلاق کے تاج کو مذہبی رنگ میں اچھالا گیا اور اپنی کھوکھلی انا اور تباہ کن ہوس کی خاطر اُسے پیروں تلے روندھا گیا۔ کیوں نہ ہو؟ طاقت، دولت، اقتدار کا نشہ ہی کچھ ایسا ہوتا ہے اور اگر یہ نشہ جہلا کو چڑھ جائے تو ملک کی ہر عمدہ روایت ان کے ہتھے چڑھ جاتی ہے۔ تاہم دلّی کے ہوش مند ووٹروں نے اپنی بے داغ سیاسی بیداری کا ثبوت دیتے ہوئے حق اور حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کی اور نفرت کی جگہ محبت کے گلے میں ور مالا ڈالی۔ غور سے دیکھا جائے تو عام آدمی پارٹی کی گذشتہ کارکردگی سارے سماج کے لیے مفید ہے۔ بالخصوص تعلیم، طب، بجلی، پانی، صفائی وغیرہ میں کیجر یوال حکومت نے ملک بھر میں قابل تقلید مثال قائم کی ہے۔ ان کی طرز حکم رانی ترقی یافتہ، مغربی ممالک اور یورپ کی طرح نظر آتی ہے۔ خدا کرے کہ دلّی کا یہ ماڈل ہند کی ہر ریاست میں ہوجائے تا کہ ہمارا وطن عزیز دن دگنی رات چوگنی ترقی کرے۔ جس کا خواب سابق صدر جمہوریہ اے پی جے عبدالکلام مرحوم نے دیکھا تھا۔ امید ہے کہ کیجر یوال حکومت آئندہ پانچ برسوں میں ماضی سے زیادہ عمدہ کا کام کرے گی۔ ادارہ اروند کیجر یوال کو تیسری مرتبہ دلّی کا وزیر اعلیٰ بننے پر مبارکباد پیش کرتا ہے۔

دلّی کے نتائج کے بعد یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہوگئی ہے کہ اگر ملک کا قائد تعلیم یافتہ ہو تو اس کی فکر بھی اعلا ہوتی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ ملک میں یہ قانون بنانا چاہیے کہ وزیر اعظم اور دیگر وزراء، علی الخصوص وزرائے اعلا، اعلا تعلیم یافتہ ہونے کے باوصف، اچھی سوجھ بوجھ رکھنے والے اور رنگ ومذہب کے بھید بھاؤ سے اُوپر اُٹھ کر کام کرنے والے دانش ور ہوں۔

ملک بھر میں سی اے اے، این آر سی، این پی آر پر کے خلاف مسلسل احتجاج جاری ہے اور ہر دن نئی طاقت کے ساتھ زور پکڑتے جارہا ہے۔ بایں وجہ سارا ملک افراتفری کا شکار ہوگیا ہے۔ سوال اُٹھتا ہے کہ اس پُر آشوب ماحول کو کیسے امن میں بدلا جائے؟ حکومتِ وقت کے علاوہ حزب مخالف کو ان سوالات پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

تلنگانہ اردو اکیڈمی کے نومنتخب سکریٹری وڈائرکٹر ڈاکٹر محمد غوث کو شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد مبارکباد پیش کرتا ہے اور امید کرتا ہے کہ صدر نشین مولانا رحیم الدین انصاری اور آپ کے ذریعہ تلنگانہ اردو اکیڈمی کی کارکردگی میں مزید اضافہ ہوگا۔

محمد محامد ہلال اعظمی

اخلاقِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

علامہ شبلی نعمانیؒ

حضرت جابرؓ بن عبداللہ انصاری کہتے ہیں کہ مدینہ میں ایک یہودی رہتا تھا، جس سے میں قرض لیا کرتا تھا، ایک سال اتفاق سے کھجوریں نہیں پھلیں اور قرضہ ادا نہ ہوسکا، اس پر پورا سال گذر گیا، بہار آئی تو یہودی نے تقاضا شروع کیا، اب کی بھی پھل کم آئے، میں نے آیندہ فصل کی مہلت مانگی، اس نے انکار کیا، میں نے آنحضرت ﷺ سے آکر تمام واقعات بیان کیے، آپؐ چند صحابہؓ کے ساتھ خود یہودی کے گھر تشریف لے گئے اور چکر لگا کر پھر یہودی کے پاس آئے اور اس سے گفتگو کی لیکن وہ کسی طرح راضی نہ ہوا، بالآخر آپؐ نے مجھ سے فرمایا کہ چبوترہ پر (مو مسقف تھا) فرش بچھادو، اس پر آرام فرمایا اور سو گئے، سو کر اٹھے تو پھر یہودی سے خواہش ظاہر کی کہ مہلت دے دو، اس شقی نے اب بھی نہ مانا، آپؐ درختوں کے جھنڈ میں جاکر کھڑے ہوگئے اور جابر سے کہا کہ کھجوریں توڑنی شروع کرو، آنحضرت ﷺ کی برکت سے اتنی کھجوریں نکلیں کہ یہودی کا قرضہ ادا کر کے بچ رہیں۔

(مجلسِ نبویؐ میں جگہ بہت کم ہوتی تھی، جو لوگ پہلے سے آکر بیٹھ جاتے تھے، ان کے بعد جگہ باقی نہیں رہتی تھی، ایسے موقع پر اگر کوئی آجاتا تو اس کے لیے آپؐ خود اپنی ردائے مبارک بچھا دیتے تھے، ایک دفعہ مقامِ جعرانہ میں آنحضرت ﷺ تشریف فرما تھے اور اپنے ہاتھوں سے لوگوں کو گوشت تقسیم فرمارہے تھے کہ اتنے میں ایک عورت آئی اور آپؐ کے پاس چلی گئی، آنحضرت ﷺ نے دیکھا تو اس کی نہایت تعظیم کی، اپنی چادر مبارک اس کے لیے بچھادی، راوی کہتا ہے کہ میں نے دریافت کیا کہ یہ کون عورت تھی، تو لوگوں نے کہا یہ حضورؐ کی رضاعی ماں تھیں۔

اسی طرح ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ آنحضرت ﷺ تشریف فرما تھے کہ آپؐ کے رضاعی والد آئے، آپؐ نے ان کے لیے چادر کا ایک گوشہ بچھادیا، پھر رضاعی ماں آئیں، آپؐ نے دوسرا گوشہ بچھادیا، آخر میں رضائی بھائی آئے تو آپؐ اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کو اپنے سامنے بٹھالیا۔ حضرت ابوذرؓ مشہور صحابی ہیں، ایک دفعہ ان کو بلا بھیجا، تو گھر میں وہ نہیں ملے، تھوڑی دیر کے بعد حاضرِ خدمت ہوئے تو آپؐ لیٹے ہوئے تھے، ان کو دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے سینہ سے لگالیا۔

حضرت جعفرؓ بھی جب حبشہ سے واپس آئے تھے، تو ان کو گلے لگالیا اور ان کی پیشانی کو بوسہ دیا۔

سلام میں پیش دستی فرماتے، راستہ میں جب چلتے تو مرد عورتیں، بچے جو سامنے آتے ان کو سلام کرتے۔ ایک دفعہ آپؐ راستہ سے گذر رہے تھے، ایک مقام پر مسلمان اور منافق وکافر یک جا بیٹھے ملے، آپؐ نے سب کو سلام کیا۔

کسی کی کوئی بات بری معلوم ہوتی تو مجلس میں نام لے کر اس کا ذکر نہیں کرتے تھے، بلکہ صیغۂ تعمیم کے ساتھ فرماتے تھے کہ لوگ ایسا کہتے ہیں، بعض لوگوں کی یہ عادت ہے، یہ طریقۂ ابہام اس لیے اختیار فرماتے تھے کہ شخص مخصوص کی ذلت نہ ہو اور اس کے احساس غیرت میں کمی نہ آجائے۔

دیباچوں میں ذکرِ شبلی کا مطالعہ

سلیمان اریب

سلیمان ادیب (۱۹۲۲ء۔۱۹۷۰ء) اردو کے ایک ادیب، شاعر اور ماہنامہ صبا حیدرآباد کے مدیر تھے۔ ۱۹۵۸ء میں انھوں نے اس احساس کے ساتھ کہ شبلی جس پائے کے عالم و مورخ تھے اب تک ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا، ماہنامہ صبا کا شبلی نمبر نکالا۔ یہ خصوصی شمارہ کئی حیثیتوں سے بہت اہم ہے خاص طور پر اس میں شامل عالم خوندمیری کا انتہائی اہم مضمون ''اسلامی فکر کی تشکیل جدید میں شبلی کا حصہ'' قابل ذکر ہے۔ اس کی اشاعت کا سبب بیان کرتے ہوئے سلیمان اریب نے لکھا ہے کہ:

''شبلی کا شمار اردو کی عہد آفریں اور تاریخ ساز شخصیتوں میں ہوتا ہے......سرسید کے بعد اگران کے گروں میں کوئی شخصیت اپنے نظریات کی انفرادیت کی وجہ سے سب سے ممتاز نظر آتی ہے تو وہ مولانا شبلی کی شخصیت ہے۔ جنھوں نے ایک مورخ کی حیثیت سے مسلمانوں میں ان کے عہد عروج کی سیاسی اور قومی زندگی کی مثالیں پیش کر کے بیداری کی نئی طرح ڈالی، شعر العجم لکھ کر اردو میں تنقید شعر کا ایک نیا اور بہت اونچا معیار قائم کیا، یہ ایک حقیقت ہے کہ اردو تنقید آج تک حالی کے مقدمہ اور شبلی کی شعر العجم کی ایسی وقیع اور مستقل اہمیت رکھنے والی تصنیفات پیش نہیں کرسکی۔ حالی کو تو وہ اہمیت مل گئی جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے، لیکن شبلی کی شخصیت اور ان کے کام کے ساتھ صحیح معنوں میں اب تک ہم نے انصاف نہیں کیا، شبلی صرف مورخ ونقاد ہی نہیں تھے خود شاعر بھی تھے۔ اور انھوں نے باوجود اسلامی نقطہ نظر رکھنے کے ہندوستان کی مسلم فرقہ وارانہ سیاست پر کانگریس کی غیر مذہبی سیاست کو ترجیح دے کر اس سے اپنا سیاسی رشتہ جوڑا۔ اس منزل پر ہم کو شبلی سرسید سے بھی آگے نظر آتے ہیں''۔ (صبا حیدرآباد شبلی نمبر ص ۶۔۷)

ڈاکٹر ابن فرید

ڈاکٹر ابن فرید (۱۹۲۵ء۔۲۰۰۳ء) کا شمار اردو کے انتہائی اہم ادیبوں اور ناقدوں میں ہوتا ہے اور وہ بلاشبہ بڑے وسیع المطالعہ اور صاحب فکر ونظر ادیب تھے۔ انھوں نے نامساعد حالات کے باوجود قلم وکاغذ کا رشتہ ہمیشہ استوار رکھا اور متعدد کتابیں سپرد قلم کیں، ان کے مقالات ومضامین کے کئی مجموعے بھی شائع ہوئے، ان کی تصانیف میں چہرہ پس چہرہ، میں ہم اور ادب، نیرنگ جہاں، یہ جہاں اور ہے، صواب دید وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

امین زبیری، مولوی عبدالحق، وحید قریشی اور شیخ اکرام نے علامہ شبلی کی شخصیت اور فکر ونظر پر جو ناروا حملے کئے تھے۔ ادبی، تنقیدی اور تحقیقی نقطہ نظر سے ان کا ڈاکٹر ابن فرید نے ایسا مسکت جواب لکھا کہ ان مصنفین کو اپنے خیالات بدلنے پڑے۔ ان کے مقالے کا نام ''شبلی چوں بہ خلوت می رود'' ہے۔ یہ مقالہ ادیب علی گڑھ کے شبلی نمبر میں شائع ہوا تھا اب ان کی

مجموعہ مضامین ''میں ،ہم اور ادب'' میں شامل ہے۔

شبلی کے حوالہ سے ان کا بڑا اہم کارنامہ ادیب کے شبلی نمبر کی ترتیب واشاعت بھی ہے، آج تک اس بلند معیار کا خصوصی شمارہ کسی رسالے نے علامہ شبلی کی شخصیت اور کارناموں پر شائع نہیں کیا، ضخامت اور مشمولات دونوں لحاظ سے یہ بہت وقیع ہے، اس کا مفصل جائزہ راقم کی کتاب ''شبلی شناسی کے سو سال'' میں شامل ہے۔

ادیب شبلی نمبر کے دیباچہ کے ایک ایک حرف سے ان کی شبلی شناسی کا اظہار ہوتا ہے جس طرح انھوں نے مقالات کے حصول کے لئے خط وکتابت کی، برابر رابطہ کرتے رہے اور شبلی نمبر کو خوب سے خوب تر بنانے کے لئے جد وجہد کی، طباعت واشاعت کے مراحل سے جس طرح نبرد آزما ہوئے اس کی تمام تفصیل انھوں نے قلم بند کی ہے۔

علامہ شبلی کے چھوٹے بھائی محمد مہدی حسن (م:۲۹رجون ۱۸۹۷ء) کے مکاتیب لندن ان کے ہاتھ آئے تو انھوں نے ان خطوط کی روشنی میں نہ صرف مہدی حسن کی صلاحیتوں کا ذکر کیا بلکہ شبلی پر کئی اعتراضات کا بھی ان خطوط کی روشنی میں سد باب کیا، یہ اپنی نوعیت کا ایک منفرد مضمون ہے جو ان کی کتاب ''میں ہم اور ادب'' میں شامل ہے۔

ڈاکٹر ابن فرید کو علامہ شبلی کی شخصیت پر لگے داغ دھبہ کو صاف کرنے کے لئے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

سید مسیح الحسن

سید مسیح الحسن نے ۱۹۹۲ء میں مولانا ابوالکلام آزاد کے حواشی ''حواشی ابو الکلام آزاد'' کے نام مرتب کئے جسے اردو اکادمی دہلی نے شائع کیا، مولانا آزاد زیر مطالعہ کتب پر حواشی لکھنے کا اہتمام کرتے تھے، علامہ شبلی کی کئی کتابوں پر ان کے حواشی اور فٹ نوٹ ہیں، ان کتابوں کے نام یہ ہیں:

۱۔ مقالات شبلی جلد اول، مذہبی
۲۔ مقالات شبلی جلد دوم، ادبی
۳۔ مقالات شبلی جلد ہفتم، فلسفیانہ
۴۔ رسائل شبلی (کاپی اول وکاپی دوم)
۵۔ سیرۃ النعمان (اول ودوم)
۶۔ شعرالعجم (اول)
۷۔ الغزالی
۸۔ مضامین عالم گیر

سید مسیح الحسن نے حواشی ابوالکلام پر ایک طویل مقدمہ لکھا ہے، چونکہ اردو کتابوں میں سب سے زیادہ حواشی علامہ شبلی کی کتب پر ہیں اس لئے نسبتاً ان کا ذکر بھی زیادہ ہے۔ یہ اگرچہ اختلافی نوٹ ہیں اور علامہ کے بعض نقطہ نظر سے مولانا آزاد نے اختلاف کیا ہے تاہم یہ حواشی مولانا آزاد کی علامہ شبلی اور ان کی کتابوں اور ان کی فکر ونظر سے گہری دلچسپی کا مظہر بھی ہیں۔

سید مسیح الحسن مرحوم نے سب سے پہلے ان کتابوں کے مطالعہ کے زمانہ کا تعین کیا ہے۔ اور تفصیل سے دکھایا ہے کہ کون سی کتاب کس سنہ میں ان کے مطالعہ میں آئی، اس میں انھوں نے قیاس سے بھی کام لیا ہے۔ الغزالی علامہ شبلی نے آزاد کو تحفہ میں ۱۹۱۲ء میں دی تھی، مسیح الحسن صاحب نے اس کا سنہ اشاعت ۱۹۰۱ء لکھا ہے حالانکہ وہ ۱۹۰۲ء میں شائع ہوئی تھی۔ مقالات شبلی، الغزالی اور مضامین عالم گیر کے سوا جن کتابوں پر حواشی ہیں ان کے زمانہ مطالعہ کی تعیین کرتے ہوئے مقدمہ نگار نے لکھا ہے کہ:

''باقی پانچ کتابوں کے متعلق قرائن سے فرض کیا جا سکتا ہے کہ وہ کتابیں مولانا نے ۱۸۹۲ء۔ ۱۹۱۰ء کے درمیانی زمانہ میں مطالعہ فرمائی کیوں کہ ان سب کتابوں پر تفصیلی تبصرے اور اختلافی تنقیدیں ہیں نیز یہی وہ دور ہے جب مولانا مشکوک وتذبذب سے گذر رہے تھے اور زبردست مطالعہ میں منہمک

تھے"۔(حواشی ابوالکلام آزاد، مقدمہ ص۳۰)

مولانا آزاد اگست رستمبر ۱۸۸۸ء میں پیدا ہوئے، محض چار سال کی عمر میں علامہ شبلی کی کتابوں کے مطالعہ کا زمانہ قرار دینا سمجھ سے بالاتر ہے۔

علامہ شبلی حنفی تھے، ایک زمانہ میں ان میں بڑی شدت تھی، سرسید کی صحبت میں کچھ کمی آئی مگر ان پر حنفیت کا ہمیشہ غلبہ رہا، مولانا آزاد سلفیت کے ذوق آشنا تھے، اس لئے ان کے بہت سے حواشی اسی کے زیر اثر آئے ہیں۔ سید مسیح الحسن صاحب نے بھی یہ بات لکھی ہے، وہ لکھتے ہیں:

"رہا الغزالی کا معاملہ، اگرچہ یہ ۱۹۱۲ء میں پڑھی ہوگی تاہم یہ بھی کچھ زیادہ بعد کا زمانہ نہیں ہے۔ اس کتاب پر حاشیوں میں حنفیت کے خلاف اظہار خیال کیا گیا ہے اور علامہ شبلی کے افکار وخیالات کی پرزور تردید کی ہے۔ یونانی فلسفہ کے بارے میں چند تاریخی واقعات سے اختلاف کیا ہے، لیکن یہاں اتنے تیز وتند اختلاف نہیں ہیں جتنے سیرۃ النعمان اور مضامین عالم گیر پر ہیں"۔(ایضاً)

مضامین عالم گیر پر بھی ان کے اعتراضات کا سبب ان کا ذوق نظر ہے، وہ علی العموم داراشکوہ کی فکر ونظر کی تائید کرتے نظر آتے ہیں، راقم نے اپنے مضمون مشمولہ متعلقات شبلی میں مضامین عالم گیر پر حواشی آزاد کا بالتفصیل جائزہ لیا ہے، اس لئے یہاں اس سے قطع نظر کیا جاتا ہے۔ البتہ یہاں یہ ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ حواشی آزاد کی اشاعت (۱۹۹۲ء) کے پچیس سال بعد بھی شبلی کے حوالہ سے ان کے اختلافات کا جائزہ نہیں لیا جاسکا۔ خاص طور پر سیرۃ النعمان اور مضامین عالم گیر پر حواشی آزاد کا مطالعہ ضروری ہے، ان دونوں کتابوں پر جو اعتراضات ہیں مقدمہ نگار نے ان کے نمونے بھی پیش کئے ہیں، طوالت کے خوف سے انھیں نظرانداز کیا جاتا ہے۔

مقالات شبلی پر بہت معمولی قسم کے نوٹس ہیں، سید مسیح الحسن لکھتے ہیں:

"مقالات شبلی جلد دوم پر محض ایک جگہ معمولی سے سہو پر اعتراض ہے، تلسی داس کی جگہ کالی داس کا نام آگیا ہے، عین ممکن ہے یہ چھپائی کی غلطی ہو۔ دوسری کتاب مقالات شبلی اول ۱۹۳۰ء کی مطبوعہ ہے، یہ کتاب مذہبی مقالات پر مشتمل ہے۔ ایک مقالہ میں عیسائی فرقوں کے ناموں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ کچھ اصطلاحوں کے استعمال سے مولانا آزاد نے اختلاف کیا ہے۔ ایک مقام پر عربی عبارت کا ترجمہ غلط قرار دیا ہے، ورنہ بحث ونظر کے تفصیلی تبصرے اس کتاب میں نہیں ہیں، تیسری کتاب مقالات شبلی جلد ہفتم فلسفیانہ مباحث پر مشتمل ہے۔ یہ ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی تھی، یہاں "استقرا" کے سلسلہ میں ایک جزوی اختلاف ہے۔ کوئی قابل ذکر بات نہیں ہے"۔(ایضاص ۲۹۔۳۰)

رسائل شبلی اور شعر العجم پر مولانا آزاد کے زبان وادب سے متعلق اختلافی حواشی کا مطالعہ ضروری ہے، مقدمہ نگار نے اس کے نمونے مقدمہ میں درج نہیں کئے ہیں۔

سید مسیح الحسن نے جناب مسعود الحسن عثمانی کا پہلے یہ بیان نقل کیا ہے کہ "آخر عمر میں مولانا آزاد کو شبلی کی نسبت بہت سی باتوں سے اختلاف بھی ہوگیا تھا اور وہ بہت سے نظریات جو شبلی کی زندگی میں ان کے ذہن پر چھائے رہے اب تبدیل ہوگئے تھے۔ شبلی کی کئی کتابوں پر مولانا نے حواشی بھی لکھے تھے جن میں شبلی کی کئی کتابوں پر اعتراض بھی ہے"۔ پھر مقدمہ نگار نے کسی قدر تفصیل سے اس بیان کا تجزیہ کیا ہے اور آخر میں

سوال قائم کیا ہے کہ وہ کون سی کتابیں ہیں اور کہاں ہیں جن پر انھوں نے اعتراض کیا ہے اور لکھا ہے کہ میں اس عقدہ کشائی سے قاصر رہا۔(ایضاص ۳۵) سید مسیح الحسن صاحب لکھتے ہیں:

"جہاں تک علامہ شبلی سے مولانا آزاد کے اختلاف کا تعلق ہے، میری نظر میں کم از کم ان حواشی کے سلسلہ میں وہ ان کے ابتدائی دور کا معاملہ ہے اور عین ممکن ہے کہ مولانا کے الندوہ سے تعلق سے ذرا پہلے مئی ۱۹۰۵ء سے قبل یا اس کے کچھ عرصہ بعد کا ہو۔ زیر بحث حواشی ہرگز مولانا کے آخری دور کی تحریریں نہیں ہوسکتیں۔ آزاد بھون کی لائبریری کے علاوہ کوئی دوسری کتابیں عثمانی صاحب کے پیش نظر رہی ہوں جن پر مولانا نے اپنے آخری زمانہ میں اعتراضات قلم بند فرمائے ہوں تو ٹھیک ہے مگر میری متلاشی نگاہ ان تک نہیں پہونچ سکی"۔(ایضاص ۳۵-۳۶)

خدا جانے ہمارے اہل قلم کس طرح تجزیہ کرتے ہیں اور کیا کیا مفہوم نکالتے ہیں، معمولی حواشی کو اختلاف سے تعبیر کرتے ہیں اور اس کا حوالہ تک نہیں دیتے۔ ایسی کوئی بات قابل ذکر ہوتی تو "آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی" میں کم از کم مولانا آزاد خود ذکر کر دیتے جیسا کہ وہ بیان کرنے میں بے باکی دکھاتے ہیں اور پھر ان کی انانیت انھیں کب چین لینے دیتی۔ لیکن علامہ شبلی سے تعلقات کا معاملہ ذرا دیگر ہے، جتنا انھوں نے شبلی کا احترام کیا شاید ہی کسی کا کیا ہو۔

علامہ رشید رضا نے جلسہ ندوہ میں جو صدارتی تقریر کی تھی اس کا ترجمہ مولانا آزاد نے کیا تھا، اس سلسلہ میں سید مسیح الحسن نے نیاز فتح پوری کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ:

"علامہ رشید رضا ایڈیٹر المنار ایک عظیم الشان اجتماع میں جو بڑے بڑے علماء پر مشتمل تھا تقریر کرنے جارہے ہیں اور ضرورت ہے ایک ایسے شخص کی جو عربی وار دو دونوں کا ماہر ہو اور ان کی عربی تقریر کا برمحل ترجمہ کرتا جائے۔ مولانا شبلی کے منصب سے یہ بات فروتر تھی کہ وہ خود یہ خدمت انجام دیں۔ اس لئے وہ اس باب میں متفکر تھے۔ آخر جز قیس کوئی اور نہ آیا بروئے کار، مولانا ابوالکلام بے تکلفانہ سامنے آتے ہیں اور اس خدمت کو اتنی خوبی ودلکشی سے انجام دیتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے وہ ترجمہ نہیں بلکہ خود تقریر کر رہے ہیں"۔(ابوالکلام آزاد مرتبہ انور عارف ص ۷-۸)

اس سلسلہ میں مولانا سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی میں جو کچھ لکھا ہے مقدمہ نگار نے اسے بھی نقل کیا ہے۔(حواشی ابوالکلام آزاد مقدمہ ص ۵۶)

سید مسیح الحسن صاحب نے مقدمہ میں حواشی کے نمونے بھی دیئے ہیں، علامہ شبلی پر جو حواشی کے نمونے ہیں وہ سیرۃ النعمان اور مضامین عالم گیر کے حواشی ہیں، مضامین عالم گیر پر جو حواشی ہیں چونکہ ان کا تنقیدی مطالعہ وتجزیہ پیش کیا جاچکا ہے، ان سے قطع نظر بطور نمونہ سیرۃ النعمان کا ایک حاشیہ نقل کیا جاتا ہے۔ علامہ شبلی کی عبارت یہ ہے:

"امام ابوحنیفہ کا مذہب عقل کے موافق ہے۔ امام طحاوی نے جو محدث اور مجتہد دونوں تھے، اس بحث میں ایک کتاب لکھی ہے جو شرح معانی الآثار کے نام سے مشہور ہے اور جس کا موضوع یہ ہے کہ مسائل فقہ کو نصوص اور طریق سے ثابت کیا جائے۔ اس دعوی سے امام ابو حنیفہ کا مذہب عقل کے موافق ہے، شافعیہ وغیرہ کو بھی انکار نہیں اور وہ انکار کیوں کرتے ان کے نزدیک احکام شرعیہ خصوصاً عبادات جس قدر عقل سے بعید ہوں اسی قدر ان کی خوبی ہے"۔(حواشی ابوالکلام آزاد ص ۶۶)

مولانا صدرالدین اصلاحی

ایمان بالآخرت

توحید کی طرح تیسری بنائے دین یعنی رسالت کا بھی حال ہے، اس قرآن نے جو مسکت اور طمانیت بخش دلائل دیئے، وہ بھی ان آئمہ کفر کے دلوں میں نہ اتر سکے، کیوں؟ اس کی وجہ آپ کو سورہ فرقان کے مطالعہ سے معلوم ہوگی، جس میں نبوت محمدیؐ پر سارے اعتراضات اور شکوک کا ازالہ فرمانے کے بعد آخر میں کہا گیا ہے کہ کَذَّبَ بِالسَّاعَةِ سَعِیْرًا ''دراصل (اس انکار مسلسل کی وجہ یہ ہے کہ) انہوں نے قیامت (محاسبۂ اعمال کے دن) کو جھٹلا رکھا ہے، ان کے لیے سعیر (جہنم) ہے''۔

بات کس طرح واضح ہوگئی، گویا توحید ہو یا رسالت یا قرآن یا کوئی اور حقیقت دین، اس پر چاہے آپ دلائل و براہین کے کتنے ہی انبار کیوں نہ لگا دیں، رائی کے برابر بھی ان کا اثر نہیں ہوسکتا، اگر مخاطب کا دل و دماغ اندیشۂ آخرت سے خالی ہو۔ عقل بھی کہتی ہے کہ ایسا ہی ہونا چاہئے اور تجربہ گواہ ہے کہ ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ اگر ایک انسان یہ نہ سمجھتا ہو کہ ایک دن مجھے اپنے اعمال کا حساب کتاب دینا ہے، خواہ سمجھنا ضعف عقل کی بناء پر ہو یا غیر ذمہ دارانہ طرز زندگی سے عشق رکھنے کی بناء پر، بہرحال کوئی وجہ بھی ہو، اس صورت میں آپ اس سے ہرگز یہ توقع نہیں کرسکتے کہ وہ توحید کے دلائل، اس کے حقائق، اس کے مقتضیات کے سننے کے لیے اپنے کانوں کو آمادہ، اپنے ذہن کو مستعد اور اپنے قلب کو متوجہ پائے گا۔ اس کے اندر ایسی سنجیدگی پیدا ہونی محال ہے۔ وہ نہیں مانتا کہ برائیوں اور نفس پرستیوں کے نتائج بُرے ہوں گے، مگر آپ ہیں کہ اس کے سامنے ایک مکمل ضابطۂ اخلاق پیش کررہے ہیں، نیکی اور تقوے کر رہے ہیں، توحید اور رسالت، دین اور شریعت، ایمان اور اطاعت کے اصول و حقائق بیان کررہے ہیں، اس کی خواہشوں پر پابندیاں لگا رہے ہیں، اس کے کیفِ زندگی کو مکدر کررہے ہیں۔ ایسی صورت میں آپ اپنی باتوں پر حقارت بھرے تبسم اور زہریلے طنز و تعریض کے سوا اس کی طرف سے اور کس سلوک کی توقع رکھ سکتے ہیں!

ایمان بالآخرت کی اس بنیادی اہمیت کی تصدیق ان بگڑی ہوئی قوموں کے حالات سے بھی ہوتی ہے، جو اپنے دعوے کی رو سے توحی و رسالت کو تسلیم کرنے والی، توحید اور معاد کو ماننے والی، اللہ کی کتاب رکھنے والی اور دین و شریعت کی علم بردار ہوتی ہیں، مگر ایمان و اسلام کے فخریہ دعاوی کے باوجود ان کے اعمال نامے خیر و صلاح کے نقوش سے قریب قریب خالی ہوتے ہیں۔ ان قوموں کی دین فراموشی کی حقیقی وجہ دراصل ان کی آخرت فراموشی ہے۔ فکرِ آخرت سے ذہن غافل ہوا کہ شرائع سے اس کا رشتہ کٹنا شروع ہوا۔ نماز اتباع شرائع کی بنیاد اور سارے اعمال خیر کا سرچشمہ ہے، جیسا کہ آگے کی تفصیلات سے معلوم ہوگا۔ جو شخص اس سرچشمہ سے رب پرستی کی قوتیں نہیں حاصل کرتا وہ نیکی سے اپنا رشتہ قائم نہیں رکھ سکتا، وہ دین کے تقاضوں کو کبھی پورا کرسکتا ہے۔ شریعت کی بندشیں اس کے نزدیک تارِ عنکبوت سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں، اخلاقی اقدار اس کی نگاہ میں ہرگز کسی اعتنا کے قابل نہیں ہوتیں۔ مختصر یہ کہ ایسا انسان مرضیاتِ الٰہی کے ذکر و فکر سے آزاد ہو کر نفس اور

شہوتِ نفس کا پرستار بن کر رہ جاتا ہے۔ بنی اسرائیل کی تاریخ شہادت دیتی ہے کہ اَضَاعُوا الصَّلٰوۃَ وَاتَّبَعُوا الشَّھَوٰتِ (بقرہ۵۹) ''انہوں نے نماز ضائع کردی اور شہوات کے پیرو بن کر رہ گئے'' گویا شہوات کی پیروی براہ راست نتیجہ تھی نماز سے بے پروائی کا۔ اب غور کرنے کی بات یہ ہے کہ نماز جیسی چیز، کی اقامت ہی پر اللہ پرستی اور اتباع واطاعتِ دین کا سارا انحصار ہے، ضائع کیوں کردی جاتی ہے؟ اس کا جواب قرآن یہ دیتا ہے کہ وَاِنَّھَا لَکَبِیْرَۃٌ اِلَّا عَلَی الْخٰشِعِیْنَ. الَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ اَنَّھُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّھِمْ (بقرہ۴۶) ''فی الواقع یہ (اقامت نماز لوگوں پر) بڑی شاق گزرتی ہے البتہ ان کے لیے نہیں جو اپنے اندر خشوع رکھتے ہیں، جنہیں اس بات کا خیال دامن گیر رہتا ہے کہ ہمیں اپنے رب کی جناب میں حاضر ہونا ہے'' تو اب حقیقت یہ نکلی کہ دین کے مرکزی ستون (نماز) کو قیام اور استحکام بخشنے والی چیز صرف خوفِ آخرت ہے، آخرت فراموشی انسان کو نماز کا تارک اور ہوائے نفس کا غلام بنادیتی ہے۔ ترکِ نماز اور اتباعِ شہوات پورا کاشانۂ دین مسمار کرکے رکھ دیتا ہے اور انسان، اسلام کو آباؤ اجداد کا ایک مقدس ورثہ سمجھ کر اسے زبانی خراجِ عقیدت پیش کرنا ہی اپنا کل فرض سمجھ لیتا ہے۔ اس طرح ایک کٹر منکرِ اسلام اور ایک دین فراموش مسلم نفسیاتی طور پر دونوں ایک ہی مقام پر کھڑے نظر آتے ہیں، جس طرح توحید کے سارے دلائل اور دعوتِ قرآنی کے واضح براہین محض اس لیے منکرِ اسلام کے لیے ہوا کی ایک سنسناہٹ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے کہ اس کے اندر محاسبۂ اعمال کا اندیشہ موجود نہیں ہوتا ٹھیک اسی طرح دین سے علمی رشتہ منقطع کرلینے والے نام نہاد مسلم پر اس وقت تک اتباعِ دین کا دروازہ بند ہی رہے گا، جب تک کہ خوفِ جزا کی کلید اس کے ہاتھ نہیں آجاتی۔ اس پہلو سے اگر دیکھا جائے تو ایمان بالآخرت کی اہمیت فزوں سے فزوں تر (کم سے کمتر) ہوجاتی ہے اور چاہے نظری طور پر وہ ایمان باللہ کی ایک شاخ ہی کیوں نہ ہو، مگر حقیقت یہ ہے کہ عملاً یہ اس سے بھی آگے دکھائی پڑتا ہے اور سارے خیر وصلاح کا مدار اصلی قرار پاجاتا ہے۔

ایمان بالآخرت کی عملاً یہی ذہنیتیں ہیں، جن کے باعث اس کو ایمان باللہ کا ایک جز اور فرع ہونے کے باوجود اساسِ دین کی تعمیر میں ایک مستقل سنگِ بنیاد کی حیثیت دی گئی ہے، جبکہ دوسرے تمام ایمانیات کو اس مقام کا مستحق نہ سمجھا گیا کیونکہ دو ایمانیات ایسے ہیں جن کے صحیح تحقق پر انسانی زندگی کے سنورنے اور منشائے الٰہی کے مطابق بسر ہونے کا انحصار ہے۔ یہ دراصل دو پہیئے ہیں جو اعمال انسانی کی گاڑی کو بندگی اور اطاعتِ حق کی شاہراہ پر چلاتے ہیں۔ اگر ان میں سے ایک پہیہ بھی غائب یا بیکار ہوجائے تو یہ گاڑی کبھی کبھی اس راستہ پر نہیں چل سکتی۔ ایسی صورت میں یہ گاڑی شیطان کے ہاتھ میں پہنچ جاتی ہے جو اس کو اس شاہراہِ حق سے ہٹا کر شر وطغیان کی سنگلاخ وادیوں میں گھسیٹتا پھرتا اور انجام کار ہلاکت کے گہرے کھڈ میں ڈال دیتا ہے۔ سچی ہدایت اور سچی اطاعت کے لیے ان دونوں عقائد کی یہی یکسانی اور بااعتبار حصولِ مقصد ایک دوسرے کی طرف یہی شدت احتیاج ہے، جس کے سبب قرآن حکیم نے دونوں کا ساتھ ساتھ ذکر کرنے کا اسلوب بیان پورے اہتمام کے ساتھ اختیار کیا ہے اور جہاں کہیں بھی اس نے توحید کی تعلیم وہدایت اور اس کے دلائل سے گفتگو کی ہے، وہاں بالعموم قیامت کے ذکر واثبات سے ضرور تعرض کیا ہے اور اسی طرح اس کے برعکس بھی۔ اس اہتمام کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ انسان کو اس کی غیر فطری مرغوباتِ نفس سے روک کر اطاعتِ الٰہی اور نیکی اور تقویٰ کے تلخ نوالوں کو حلق سے نیچے اتار لینے پر آمادہ کرنا نہ تو تنہا عقیدۂ توحید کے بس میں ہے اور نہ ہی عقیدۂ آخرت کے امکان میں۔

مولانا انصار احمد معروفی۔ پورہ معروف مئوناتھ بھنجن، اترپردیش

آئینِ ہند اور ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر

ہمارا ہندوستان دنیا میں سب سے بڑا جمہوری ملک ہے، جمہور کا مطلب عوام ہوتا ہے، جمہوری ملک کا مفہوم عوامی اور غیر شاہی ملک ہے، جمہوریت فکری، آزادی، اور رائے کے احترام کا تقاضہ کرتی ہے، اگر ملک میں جمہوریت کی جڑیں مضبوط ہوں گی تو جمہوریت کو ملک کی ترقی اور عوام کی فلاح کے لیے کارگر طریقے سے استعمال کیا جاسکے گا۔

جمہوریت کیا ہے؟ اس کا جواب اکثر لوگ کچھ اس طرح دیتے ہیں کہ جمہوریت وہ طرزِ حکومت ہے جہاں عوام کی حکومت عوام کے مفاد کے لیے عوام کے ذریعے تشکیل دی جاتی ہے، مگر بابا صاحب بھیم راؤ امبیڈکر نے جمہویت کی جو تشریح کی ہے وہ اس سے ایک قدم آگے ہے، ان کا ماننا ہے کہ جمہوریت میں حکومت سازی کا عمل اکثریتی ووٹ سے ہی طے ہوتا ہے مگر اس کا یہ قطعی مطلب نہیں کہ اکثریتی حکومت اقلیتی طبقات کے مفادات اور اقتدار میں ان کی حصہ داری کو نظر انداز کردے۔ امبیڈکر صاحب چاہتے تھے کہ آزاد ہندوستان میں سبھی طبقے کو ان کا واجب حق اور ان کی صحیح نمائندگی ملے۔ ۶ رمئی ۱۹۴۵ء کو بمبئی میں واقع آل انڈیا ایس سی فیڈریشن کی سالانہ تقریب میں بولتے ہوئے انہوں نے کہا" کہ کسی بھی صورت میں ایک طبقہ دوسرے طبقہ پر اپنا تسلط نہ جمائے"۔

امبیڈکر صاحب: ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر صاحب کی پیدائش ۱۴ راپریل ۱۸۹۱ء کو ہوئی، اور وفات ۶ ردسمبر ۱۹۵۶ء کو دہلی میں ہوئی۔ یہ ایک سیاسی رہنما، فلسفی، انسان دوست، تاریخ داں، ماہر اقتصادیات، اور بدھ مت کے مصلح تھے، آزاد بھارت کے پہلے وزیر قانون کی حیثیت سے وہ بھارتی دستور کے اہم مصنف تھے۔ انہیں بابا صاحب کے نام سے بھی جانا جاتا ہے، ڈاکٹر امبیڈکر صاحب کے نہ صرف دلتوں اور کمزور طبقات بلکہ مسلمانوں پر بھی بڑے احسانات ہیں جنھوں نے ایک ایسا دستور دیا جس میں مذہبی اور لسانی اقلیتوں کے تعلیمی حقوق کو بنیادی حقوق کا درجہ دیا گیا ہے۔ آئین ہند جمہوریہ ہندوستان کا دستور اعلیٰ ہے، اس ضخیم قانونی دستاویز میں جمہوریت کے بنیادی، سیاسی نکات اور حکومتی اداروں کے ڈھانچہ، طریقۂ کار، اختیارات اور ذمہ داریوں نیز بھارتی شہریوں کے بنیادی حقوق، رہنما اصول اور ان کی ذمہ داریوں کو بیان کیا گیا ہے۔ آئین ہند دنیا کا سب سے ضخیم تحریری دستور ہے، اور آئین ہند کی مجلس مسودہ سازی کے صدر امبیڈکر صاحب کو عموماً اس کا معمارِ اعظم کہا جاتا ہے۔

آئین ہند کے مطابق بھارت میں دستور کو پارلیمان پر فوقیت حاصل ہے، کیوں کہ اسے مجلس دستور ساز نے بنایا تھا، نہ کہ بھارتی پارلیمان نے۔ آئین ہند کو مجلس دستور ساز نے ۲۶ رنومبر ۱۹۴۹ء کو تسلیم کیا تھا، اور ۲۶ رجنوری ۱۹۵۰ء کو نافذ کیا تھا، آئین ہند بھارت کو آزاد سماجی، سیکولر اور جمہوری ملک بناتا ہے۔ جہاں عوام کے تئیں انصاف، مساوات اور حریت کو یقینی بناتا ہے، اور برادری کو فروغ دینے پر ابھارتا ہے۔ مجلس دستور ساز کے ارکان کو صوبائی اسمبلیوں

کے منتخب ارکان نے منتخب کیا، اور مجلس کے ارکان کی تعداد ۳۸۹ر تھی، لیکن تقسیم ہند کے بعد ان کی تعداد ۲۹۹ر کر دی گئی۔ آئین کو بننے میں کل ۳ر سال لگ گئے، اور اس دوران میں ۱۶۵ر ایام پر محیط ۱۱ر اجلاس منعقد کیے گئے، مجلس کا حتمی اجلاس ۲۴ر جنوری ۱۹۵۰ء کو منعقد ہوا، دو دن کے بعد ۲۶ر جنوری ۱۹۵۰ء کو یہ نسخہ بھارت کا قانون بن گیا، نفاذ کے بعد دستور میں کئی مرتبہ ترمیم کی جا چکی ہے، حکومت بھارت کا پارلیمانی نظام اسی آئین کی مدد سے چلتا ہے، کوئی بھی حکومت ہو، وہ آئین ہند کی پابند رہے گی۔

امبیڈکر صاحب اور اقلیت: بابا صاحب خود ایسے طبقے سے تعلق رکھتے تھے جنہیں کئی بار ظلم وستم کا سامنا کرنا پڑا، وہ متعدد بار اکثریتی طبقہ کی طرف سے ستم رسیدہ بھی تھے، اس لیے انہوں نے اس مجلس کے سربراہ کے طور پر دوراندیشی سے کام لیتے ہوئے اقلیتی طبقے کا خاص خیال رکھا ہے۔ جب آئین ساز اسمبلی میں بحث کے دوران میں اقلیت کی جگہ "ہر شہری" کی اصطلاح پر زور دیا جا رہا تھا، تو امبیڈکر صاحب نے اس کی سخت مخالفت کی، اور مزاحمت کی تھی، آئین میں مذہب اور اس کی اشاعت، نیز تعلیمی ادارے چلانے اور مذہب کی نشر واشاعت کی پوری آزادی حاصل ہے، چنانچہ آئین کی دفعہ ۳۰ر کے تحت مذہبی اقلیتوں کو اپنے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور چلانے کی پوری آزادی فراہم کی گئی، نیز مادری زبان میں تعلیم اور مذہب وعقیدے وثقافت پر چلنے اور اس کی تبلیغ کی آزادی دفعات ۲۵ر اور ۲۶ر میں عطا کی گئی۔ امبیڈکر صاحب اس بات سے بھی فکر مند تھے کہ آزاد ہندوستان میں اقلیتی طبقات پر اکثریتی طبقات اپنی تعداد کی بنیاد پر غالب نہ ہو جائے، اور اپنے مفادات ان پر نہ تھوپے، ان کے نزدیک اگر اقلیتوں پر اکثریتی طبقے کا تسلط تھوپ دیا جائے تو یہ جمہوری اقدار کی سخت خلاف ورزی ہوگی۔

انہوں نے خود اپنی زندگی میں طرح طرح کے تعصب، ظلم وستم برداشت کیے، اچھوت ہونے کی وجہ سے اعلیٰ ذات کے لوگوں نے ان کے ساتھ زندگی کے ہر موڑ پر بھید بھاؤ کیا، اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کو امبیڈکر صاحب کی اس بات سے چڑھ تھی، کہ وہ ذات پات، چھوا چھوت پر مبنی بھید بھاؤ کے مسئلے کو قومی سیاست کے مرکز میں لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہیں دوسری طرف قومی تحریک سے وابستہ اعلیٰ ذات پر مبنی قیادت ان سوالوں کو دبا کر اقتدار کی کمان انگریزوں سے اپنے ہاتھوں میں لینا چاہتی تھی، امبیڈکر صاحب اس بات سے بھی فکر مند تھے کہ اگر ہندوستان آزاد ہوتا ہے تو یہاں کے محکوموں اور مظلوموں کو کیا کیا حقوق دیئے جائیں گے، ان کو اس بات کی بھی فکر تھی کہ آزاد ہندوستان میں محکوم اور مظلوم طبقات کو اقتدار میں واجب حصہ داری مل پائے گی بھی یا نہیں؟

قانون ہند کی کچھ اہم باتیں: آئین ہند میں ہر قوم و مذہب اور ہر ذات پات کے لوگوں کے لیے انصاف، رواداری، اور مساوات کے اصول کو خاص طور پر مدنظر رکھا گیا ہے، آئین ہند کی ۴۲ویں ترمیم کی رو سے ہندوستان کو سیکولر اسٹیٹ کہا گیا ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ اس ملک میں ہر مذہب کا مساوی طور پر احترام لازم ہے، اور مذہب کی بنیاد پر کسی کے ساتھ کسی قسم کا کوئی امتیازی سلوک نہیں کیا جائے گا، اور نہ ہی مذہب یا ذات پات کی بنیاد پر ملک کے کسی شہری کو شہریت کے حقوق سے محروم کیا جائے گا۔

آئین ہند کی رو سے ہر ہندوستانی شہری؛ چاہے وہ کسی بھی مذہب کا ماننے والا ہو، قانون کی نگاہ میں برابر ہے، اور ہر شہری کو آزادئ رائے، آزادئ خیال، اور آزادئ مذہب کا حق حاصل ہے، دستور ہند میں اقلیتوں کو بھی ان کا حق دیا گیا ہے کہ

وہ علاحدہ اپنے تعلیمی ادارے قائم کرسکتی ہیں، اپنی تہذیب، تمدن، اور زبان کوفروغ دے سکتی ہیں، اور اپنے مذہب کی اشاعت کرسکتی ہیں۔ ہندوستان میں اوقاف، مساجد، اور مدارس کی جائیداداور آمدنی پر کوئی ٹیکس بھی نہیں ہے۔ اسی طرح آئین کی متعدد دفعات میں شخصی آزادی کا تحفظ کیا گیا ہے۔ قانون کی خلاف ورزی کرنے پر کسی شخص کو صرف اس وقت سزادی جاسکتی ہے جب اس پر لگایا گیا الزام قانون کی نگاہ میں بھی جرم ہو، چنانچہ کسی شخص کو مقدمہ چلانے اور اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع دیئے بغیر کسی قسم کی سزانہیں دی جاسکتی۔

اس طرح دستور ہند میں اقلیتی اور اکثریتی طبقہ؛ دونوں کے حقوق کا مکمل لحاظ کیا گیا ہے، یہ اگر حقیقی معنوں میں نافذ العمل ہوجائے تو ہندوستان ترقی کی راہ میں کسی بھی ملک سے آگے جانے کی صلاحیت رکھتا ہے، کیونکہ اس کے اصول وقوانین میں کسی پر ظلم وستم روا رکھنے اور اسے مذہب یا ذات پات کی بنیاد پر دبانے کوشش نہیں کی گئی ہے ، بلکہ ہر ایک کو اس کے اپنے اپنے میدان میں ترقی کی راہ پر چلتے رہنے کی تحریک کی گئی ہے۔

یوسف جمیل جامعی، کرنول (آندھراپردیش)

شاہین باغ کے نام

آبروئے ملک و ملت اے مرے شاہین باغ
جل رہا ہے تجھ سے آزادی کا بھارت میں چراغ

تو نے اک تاریخ تو ترقیم کی ہے ہند میں
جس کے شاہد ہیں زمیں و آسماں یہ باغ و راغ

دَل رہا ہے مونگ سینے پر حکومت کے تو ہی
تجھ سے چھلنی دل ہے اس کا اور جگر ہے داغ داغ

سیر تیری شہرہ آفاقوں نے کی تو یوں کہا
حوصلہ مندی سے زن کی دل ہوا ہے باغ باغ

جرأت رِندانہ تیری دیکھ اے شاہیں صفت
نالہ و شیون کناں ہے اب عدو کا زاغ زاغ

مل نہ جائے جب تلک مظلوم کو دستوری حق
غیر ممکن غیر ممکن غیر ممکن ہے فراغ

مفت میں بدنام کرکے کاٹ کھانے کے لیے
حکمراں و میڈیا کو چاہئے تیرا سراغ

کاسہ لیسی پر ہمیں مجبور کرنے والے سن
کل کو تیرے ہاتھ میں ہوگا غلامی کا اَیاغ

مات کھائیں گے کسی دن وقت کے فرعون بھی
گو سمجھتے ہوں ہمیں ہیں وقت کے عالی دماغ

جان لو دستور ہی کی پاسداری میں بقاء
ہے پیامِ خلق یوسف، مالنا الا البلاغ

ڈاکٹر مسعود جعفری۔حیدرآباد

سردار جعفری: ظہور ذات وصفات کا شاعر

ترقی پسند تحریک کے رہنما،نظریہ ساز شخصیت علی سردار جعفری کی تھی۔وہ 29 نومبر1913 میں اتر پردیش کے ایک قصبہ بلرام پور میں ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔بچپن ہی سے علم وحکمت کی باتیں سماعتوں سے ٹکراتی رہیں۔محرم کی مجالس سے آشنائی ہوئی۔مرثیوں اورنوحوں سے واقف ہونے لگے۔پندرہ برس کی عمر میں مرثیہ لکھا۔اس کا ایک شعر دیکھیے۔

آتا ہے کون شمع امامت لئے ہوئے
اپنے جلو میں فوج صداقت لئے ہوئے

وہ1930 میں لکھنو پہونچے۔اس وقت ان کی عمر اٹھارہ سال تھی۔وہاں انہوں نے سرویس امتحان دیا۔کامیاب ہوئےلیکن ملازمت نہیں کی۔وہ1933 میں علی گڑھ یونیورسٹی میں شریک ہوئے۔یہیں سے ان کی ادبی زندگی کا آغاز ہوا۔یہیں ان کے فکروفن کوجلا ملی۔علی گڑھ ہی میں انہوں نے کارل مارکس،گوئیٹے،رومی،حافظ،نطشے،کبیر،نانک کو پڑھا۔یہیں پر اقبال سے اکتساب کیا۔یہیں پر لفظ بورژوا کے معنی تلاش کئے۔وہ پیکرعلم وآگہی بن گئے۔ان کی دلنواز شخصیت میں اور چار چاند لگ گئے۔ان کا ایک ملکی ہی نہیں عالمی وژن بن گیا۔ان کی شاعری میں دہقان،مزدور،فلاکت زدہ عوام کی تصویریں ابھرنےلگیں۔وہ ایشیا اور تیسری دنیا کی آواز بن گئے۔ان کا پہلا شعری مجموعہ پرواز1944 میں شائع ہوا۔انہوں نے اسے کمیونسٹ رہنما پی سی جوشی کے نام معنون کیا۔ایک شعرلکھا گیا۔

کھل گیا در پڑ گیا دیوار زنداں میں شگاف
اب قفس میں جنبش صد بال وپر ہونے کو ہے

سردار جعفری کا شعری آہنگ انقلابی ہونے لگا۔ان کی احتجاج کی لو تیز سے تیز تر ہونے لگی۔وہ سامراج کوللکارنے لگے۔انہیں قید وبند کی صعوبتیں بھی سہنی پڑیں۔وہ اپنے راستے سے نہیں ہٹے۔ان کے قدم متزلزل نہیں ہوئے۔وہ وقت کے مصائب وآلام برداشت کرتے چلے گئے۔جبین پر شکن نہیں پڑی۔ایک مشاعرے میں جب مجاز نے اپنی نظم انقلاب سنائی توسردار جعفری نے سماج پڑھی۔

تمناؤں میں کب تک زندگی الجھائی جائے گی
کھلونے دے کے کب تک مفلسی بہلائی جائے گی
نیا چشمہ ہے پتھر کے شگافوں سے ابلنے کو
زمانہ کس قدر بے تاب ہے کروٹ بدلنے کو

ان اشعار میں ایک نئے سماج کی تخلیق کا تصور کارفرما ہے۔شاعر پرانے فرسودہ نظام کے ٹوٹ کر بکھر جانے کا مژدہ سنا رہاہے۔نئے سماج کی بشارت دے رہاہے۔یہیں سردار جعفری کی شاعری حیات آفریں ہو جاتی ہے۔وہ نئی صبح کے نقیب بن جاتے ہیں۔

سردار جعفری پہلی جنگ عظیم اور دوسری جنگ عظیم کی تباہ کاریوں پر تلملا اٹھتے ہیں۔وہ فسطائیوں کوانتباہ دیتے ہیں۔انہیں چیلنج کرتے ہیں۔سردار کے انقلابی تیور ملاحظہ کیجئے۔

جنگ باز خونخوارو

ہم تمہیں سزا دیں گے
یہ غرور زرداری
خاک میں ملا دیں گے
خون کے پیاسے ہو
ہم مزہ چکھا دیں گے
وہ نظام وہ دنیا
جس میں جنگ پلتی ہے
ایک دن مٹا دیں گے

سردار جعفری ترقی پسند تحریک کے ایک قدآور پیمبر تھے۔وہ کمیونسٹ پارٹی کے سرگرم کارکن بھی تھے۔پارٹی کے ترجمان نیا ادب سے وابستہ تھے۔ان کا مارکسی آئڈیالوجی پر کامل یقین تھا۔رسویت یونین کے زوال تک اس اشتراکی نظریہ کے پاسبان و ترجمان رہے۔روحانیت کو خیالی جنت سمجھتے تھے۔وہ توہمات کے قائل نہیں تھے۔ہر چیز کو عقل کی میزان میں رکھتے تھے۔ان کی شاعری مزدوروں،کسانوں،کارخانوں کے کرم چاریوں کی آواز رہی۔وہ سحرالبیان خطیب بھی تھے۔ان کی سحرزدہ گفتگو سامعین کو دم بخود کر دیتی تھی۔ بات میں بات پیدا کرنے کا ہنر ان سے زیادہ کسی اور ادیب و شاعر کو نہیں آتا تھا۔نصف صدی تک وہ محفل شعر و نغمہ پر سایہ فگن رہے۔وہ جب تک زندہ رہے دیگر اشتراکی سکون سے سوتے رہے۔انہیں یقین تھا کہ سردار ہی سیاست،صحافت اور ادبی معرکہ آرائی سے نمٹنے کی صلاحیت اور حوصلہ رکھتے ہیں۔ادبی و سیاسی مباحثے انہی کے سہ ماہی رسالے گفتگو میں آکے سانس لیتے تھے۔وہ قومی و عالمی مسائل پر تفصیل سے روشنی ڈالتے تھے۔وہ اپنے ہمعصر لوک پریہ شاعر جگر مرادابادی کے دو مشہور شعروں میں ایک شعر کی نفی تھے اور دوسرے شعر کا اثبات تھے۔ملاحظہ فرمائیے۔

فکر جمیل خواب پریشاں ہے آج کل
شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل

سردار جعفری اس شعر کے مرکزی نکتہ سے مکمل اتفاق رکھتے تھے۔وہ جلتے ہوئے گردوپیش میں غزل خوانی کو درست نہیں سمجھتے تھے۔وہ چاہتے تھے کہ شاعر کارزار حیات کی کشاکش میں شرکت کرے۔اپنا حرکیاتی کردار نبھائے۔نیکی اور بدی کے درمیان خط فاصل کھینچے۔ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھنا ان کے اشتراکی مسلک میں کفر سے زیادہ بدترین گناہ تھا۔البتہ سردار جعفری ظروف کے شہر مرادآباد کے مکین جگر کے اس شعر سے صد فیصد عدم اتفاق رکھتے تھے۔

ان کا جو کام ہے وہ اہل سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہونچے

سردار جعفری کا تعلق سیاست سے ایسا ہی تھا جیسے ایک پھول کا شاخ سے یا ایک ماہی کا آب رواں سے رہتا ہے۔ان کی سوچ،فکر اور شاعری سیاسی ہی تھی۔وہ کیسے اور کیوں کر سیاسیات سے دستبردار ہو کر زندگی گزارتے اور صرف پیغام محبت کے دائرے میں اسیر ہو جاتے۔یہ ان کے لئے ممکن نہیں تھا۔وہ تاریخ کے جدلیاتی تصور کے قائل تھے۔پرولتاریہ حکومت ان کی منزل تھی۔وہ ماورائے کائنات کی دنیا کے ماننے والے نہیں تھے۔جو کچھ ہے یہی ہے۔اس کے سوا کچھ نہیں۔جس طرح صیاد اپنے بچھائے ہوئے دام میں الجھ جاتا ہے بری طرح پھنس جاتا ہے۔اسی طرح سردار جعفری بھی اپنی ایک محبوب نظم میرا سفر میں مارکسیت کی ساری جڑیں اکھاڑ پھینک دیں۔اشتراکیت کے پرندے کے بال و پر نوچ ڈالے۔اپنے اسلاف کی طرز فکر کی دھجیاں اڑادیں۔آواگون،تناسخ ارواح یا Transmigration Of Soul کے حدی خوان بن گئے۔ان کی نظم میرا سفر کی صدا سن کر سجاد ظہیر اپنی قبر میں بے چین ہو گئے ہوں گے۔وہ کہہ رہے ہوں گے سردار یہ کیا بکواس کئے جا رہے ہو۔سردار جعفری جنم جنم کی

ولادت کے نظریہ کو ماننے لگے۔ یہ مارکسی جدلیات کی نفی ہے۔ بورژوائی خیال ہے۔ سردار کے شعر ملاحظہ کیجئے۔ سردار کی خیالی دنیا۔ میرا سفر

لیکن میں یہاں پھر آؤں گا
بچوں کے دہن سے بولوں گا
چڑیوں کی زباں سے گاؤں گا
جب بیج ہنسیں گے دھرتی میں
اور کونپلیں اپنی انگلی سے
مٹی کی تہوں کو چھیڑیں گی
میں پتی پتی کلی کلی
اپنی آنکھیں پھر کھولوں گا
سر سبز ہتھیلی پر لے کر
شبنم کے قطرے تو لوں گا
میں رنگ حنا آہنگ غزل
انداز سخن بن جاؤں گا
رخسار عروس نو کی طرح
ہر آنچل سے چھن جاؤں گا

میرا سفر ایک طویل نظم ہے۔ سردار جعفری نے اپنے انقلابی اشتراکی افکار کو خیر باد کہتے ہوئے تناسخ ارواح کے فرسودہ و پامال موضوع کو نظم کا عنوان بنایا۔ سویٹ یونین میں کمیونزم کے زوال کے بعد شاید وہ مایوس Disappoint یا دل گرفتہ ہوگئے اور اسی عالم میں یہ رجعت پسند نظم لکھی۔ ایک خاص بات یہ تھی کہ سردار جعفری اس نظم کو مشاعروں میں سنانے لگے تھے۔ چاہے اس کی فرمائش ہو نہ ہو وہ اسے با آواز بلند تحت میں پڑھا کرتے تھے۔ وہ اس کو اتنے پیار سے کیوں سناتے تھے۔ پتہ نہیں۔ وہ اپنے نام کے ساتھ سید کا لفظ بھی لکھنے لگے تھے۔ امریکہ کے ایک مشاعرے میں کربلا پر ایک نظم پڑھی اور کہا کہ اس کے بعد کوئی شاعری نہیں ہوگی۔ بہر حال بیسویں صدی کے اس عظیم شاعر کی زندگی کے واقعات نہایت دلچسپ اور متاثر کن ہیں۔

احمد علی برقی اعظمی۔ دہلی

غزل

گردشِ حالات کی ناسازگاری ہائے ہائے
ہے لبوں پر ہر کسی کے آہ و زاری ہائے ہائے
کرتا ہے تیغِ زباں سے ہر گھڑی جو اپنی وار
بھول جاؤ؟ں کیسے اُس کی ضربِ کاری ہائے
کاش سن لیتا وہ میرا ماجرائے دردِ دل
کب کرے گا آ کے میری غمگساری ہائے ہائے
ہوگا کب حاصل اسے اس بیقراری سے قرار
کرتا ہے سوز دروں جو دلفگاری ہائے ہائے
غم کے ماروں کی وہ آخر کب سنے گا عرض حال
اس کی ہے ناگفتہ بہ غفلت شعاری ہائے
بھر رہا تھا جو بظاہر دوستی کا میری دم
بھول بیٹھا ہے وہ راہ و رسمِ یاری ہائے
باغ ہستی کا سمجھتا تھا جسے میں پاسباں
مُرغِ دل وہ مرے نکلا شکاری ہائے ہائے
جس کو میں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا تاجدار
ہے وبالِ جاں یہ اس کی تاجداری ہائے
اب کفِ افسوس مَلتا ہے وہ برقی اعظمی
ہوگئی بیکار جس کی جاں نثاری ہائے ہائے

ڈاکٹر نادر المسدوسی۔ایم۔اے،ایم۔فل،پی ایچ۔ڈی (صدر بزم علم وادب) حیدر آباد

عورت کا حقیقی مقام

اللہ رب العالمین کی جانب سے قیامت تک بنی نوع انسان کی ہدایت کے لئے رحمۃ للعالمین ﷺ کے ذریعہ قرآن مجید کو نازل کیا گیا ہےاوراس سے متعلق واضح اعلان بھی کردیا گیا ہے کہ ’’یہ وہ کتاب ہے جس میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے‘‘۔

قرآن مجید میں انسان کی زندگی کے تمام شعبہ جات کا احاطہ کرتے ہوئے احکامات اور طرز حیات کوواضح انداز سے پیش کردیا گیا ہےاسی لئے اسے دستوراورقانون بھی کہاجاتا ہےاورپھر اسوۂ رسول ﷺ کے ہرعمل اورارشادمبارک کو ہمارے لئے یعنی ہر انسان کے لئے بطور نمونہ عملی طور پر پیش کردیا گیا ہے اسی طرح قرآن مبین اورسنت رسول اللہ ﷺ کوشریعت محمدی کہاجاتا ہےاب جوکوئی اللہ تعالیٰ اوراس کے رسول ﷺ پراس کی نازل کردہ کتابوں پرفرشتوں پر جنت ودوزخ پراورتقدیر پرایمان لاتے ہوئے زبان سےاقرارکرے گااسے مسلم کہاجائیگا۔اورمسلم کےلغوی معنی سلامتی کے ہیں یعنی جس کسی نےشریعت محمدی ﷺ کوتسلیم کرلیااوروہ دین اسلام میں داخل ہوگیااسے سلامتی حاصل ہوگئی۔اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ جوکوئی حدود اللہ میں اپنی زندگی گزارے گا وہ دنیا وآخرت میں کامیاب وکامران ہوگااورجوکوئی ان حدودکوپھلانگنے یا دائرہ سے باہرمن مانی زندگی گزارے گاوہ دنیاوآخرت میں نقصان وخسارے میں رہے گا ہوسکتا ہے دنیاوی مختصرسی زندگی میں اگر وہ نقصان میں نہ رہےتو یہ بات توحق ہے کہ وہ آخرت کی زندگی میں ضرورخسارے میں رہے گا۔یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان والوں ہی سے مخاطب کرتے ہوئے توجہ دلایا ہے کہ’’اے ایمان والو اسلام میں پورے کے پورے داخل ہوجاؤ‘‘......اس سے یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ ایمان تو قبول کرچکےاوراسلام میں داخل بھی ہوگئے لیکن اس کا ثبوت عمل سے پیش کرنا ہوگا کہ تمہارے شب وروز اورزندگی کے تمام معاملات اللہ تعالیٰ کے احکامات کے تحت ہونے چاہئے۔ایمان کے ساتھ عمل صالحہ کوبھی جوڑدیا گیا ہے۔

اور یہ جواحکامات ہیں مرداورعورت دونوں کے لئے ہیں اس میں کسی کی تخصیص نہیں ہے۔اسلام ہی نے ماں کے قدموں کے نیچے جنت ہونے کا اعلان کیا ہےاسلام نے ہی شریک حیات کی زندگی کی گاڑی کا دوسرا پہیہ قراردیااوراسے برابری کا مقام دیتے ہوئے آزادرکھااورغلامی سے بچایا۔اسلام ہی نے بیوی اور بیٹیوں کو وراثت کا حصہ دار قرار دیا۔ اس کے علاوہ سخت اور تھکادینے والی باہر کی محنت سے بچاکراسے اپنی آل والادکوسینے سے لگاکران کی پرورش کرتے ہوئے ہونہار بنانے کی عظیم ترین ذمہ داری سپردکی ہےاوراپنی محبت سے گھر کوسنوارنے سجانے اور اسے جنت نشان بنانے کا موقع فراہم کیا۔تاکہ تھک تھکایا ہوا شوہر جب گھر آئے تواس کی تھکن دور ہوجائے ان تمام چیزوں کے علاوہ عورت کی سب سے اعلیٰ ترین اوراہم ترین ذمہ داری یہ ہے کہ وہ آئندہ اٹھ کھڑے ہونے والی ایک عظیم قوم کی نگہداشت کرے جوہرگھر میں علیحدہ علیحدہ پرورش پارہی ہےاورانفرادی توجہ اورعمدہ تربیت کے مستحق ہےاس کی مشفقانہ نگہداشت عمدہ اٹھان، صالح معاشرہ کی تشکیل دیانتدارانہ اخلاق محنت ومشقت کی عادت، بڑوں کاادب، چھوٹوں پرشفقت، فی سبیل اللہ کاجذبہ، خدا

جی بی عائشہ۔ ریسرچ اسکالر، ایس وی یونیورسٹی تیروپتی آندھرا پردیش

ڈاکٹر راہی فدائی کی نثری تصنیفات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ

مولانا ظہیر احمد باقوی اردو کے علمی و ادبی حلقوں میں راہی فدائی کے قلمی نام سے شہرت رکھتے ہیں۔ موصوف صوبۂ آندھرا کے خطہ رائلسیما اور ضلع کڈپہ کے متوطن اور ایک علمی و مذہبی گھرانے کے چشم و چراغ ہیں ان کے والد الحاج ٹی. یوسف نائیک مرحوم ہیں۔ راہی فدائی نائیک مرحوم کے گھر 9/نومبر 1949ء کو کڈپہ میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم کڈپہ میں ہوئی لیکن طالب علم اور استاد کی حیثیت سے انہوں نے عمر عزیز کا زیادہ تر حصہ ٹاملناڈو کے شہر ویلور میں گذارا۔ ڈاکٹر راہی فدائی کی ذہنی نشو و نما اور فکری بالیدگی میں جنوبی ہند کی مشہور زمانہ دینی درس گاہ باقیات الصالحات کے قابل اساتذہ کی رہبری نے اہم کردار ادا کیا ہے۔

ڈاکٹر راہی فدائی نے میسور یونیورسٹی سے ایم.اے.اردو کا امتحان بدرجۂ اول کامیاب کیا اور سری وینکٹیشورا یونیورسٹی تروپتی سے پروفیسر سلیمان اطہر جاوید صاحب کی نگرانی میں ویلور کے مدارس کی علمی و ادبی خدمات کے موضوع پر تحقیقی مقالہ سپردِ قلم کرکے ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری حاصل کی۔

مولانا راہی فدائی صاحب کو دار العلوم باقیات الصالحات کے دینی علمی و ادبی ترجمان ''سفیر و نفیر'' کی ادارت کا دیرینہ تجربہ بھی حاصل ہے۔ انہوں نے اس کے پچیس شمارے مرتب کرکے شائع کیے۔ جہاں تک ڈاکٹر راہی فدائی کے ادبی کارناموں کا تعلق ہے وہ جدید لب و لہجہ کے ایک کمال سخن ور بھی ہیں اور دیدہ ور محقق و نقاد بھی، اب تک ان کی تقریباً 35 پینتیس شعری اور نثری تصانیف شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں جن کی تفصیل یہ ہے۔

(الف) شعری مجموعے :

1 - لہجہ - (شراکتی مجموعہ) - 1974ء
2 - التسلیلہ - (شراکتی مجموعہ) - 1978ء
3 - تصنیف - 1981ء
4 - اناجل - 1990ء
5 - ترقیم - 1990ء
6 - مصداق - 1993ء
7 - ایہا الناس - 1998ء
8 - نبراس - 2003ء
9 - یا صاحب الجمال - 2007ء
10 - فیہا (کلیاتِ غزل) - 2008ء
11 - مہبطِ انوار (نعتیہ مجموعہ) - 2009ء
12 - استدراک - 2011ء
13 - استعجاب - 2012ء
14 - ناعت و منعوعات - 2014ء
15 - گنج شائگاں (قصیدہ کا مجموعہ) - 2016ء

(ب) تحقیقی و تنقیدی مضامین پر مشتمل نثری تصنیفات :

1 - باقیات ایک جہاں (اشاعت اول) - 1980ء
2 - باقیات ایک جہاں (اشاعت دوم) - 2013ء
3 - تجزیہ - 1988ء
4 - مسلکِ باقیات - 1991ء
5 - اکتسابِ نظر - 1991ء
6 - کڈپہ میں اردو (اشاعتِ اول) - 1992ء
7 - کڈپہ میں اردو (اشاعتِ دوم) - 2013ء
8 - اوراقِ جاوداں (مکاتیب مشاہیر) - 1994ء
9 - مدرسہ باقیات کے علمی و ادبی کارنامے - 1996ء
10 - ویلور تاریخ کے آئینہ میں (اشاعت اول) - 1997ء
11 - ویلور تاریخ کے آئینہ میں (اشاعت دوم) - 2010ء
12 - دار العلوم لطیفیہ کا ادبی منظر نامہ - 1997ء
13 - جوئے شیر - 2000ء

14 - قلمِ رو فکر - 2002ء
15 - نقوشِ بلند فکر (مرتب) - 2005ء
(علیم صبانویدی کے مضامین کی ترتیب وتہذیب)
16 - چہرہ چہرہ روشن (مرتب) - 2006ء
(علیم صبانویدی کے مضامین کی ترتیب وتہذیب)
17 - قدیم ہندوستان میں علومِ دین کے سرچشمے - 2009ء
18 - حیدرآباد کا شعروادب (مرتب) - 2012ء
(علیم صبانویدی کے مضامین کی ترتیب وتہذیب)
19 - استشہاد - 2012ء
20 - مدرکات - 2013ء
21 - باقیات ایک جہاں - 2013ء
22 - مصدقات - 2015ء
23 - خانقاہِ اقطابِ ویلور کے علمی آثار - 2016ء
24 -Glimpses History - 2016ء
25- شواہد - 2017ء
26 - مرأۃ الحق - 2018ء
27- علاقے کڑپے کے نایاب تاریخی کتبے - 2018ء
28- ادبیاتِ ویلور - 2018ء

بلا شبہ راہی فدائی صاحب کی ان کتابوں نے علمی وادبی حلقوں میں شرفِ قبولیت حاصل کی۔ مولانا راہی فدائی نے اپنی زندگی کے چونسٹھ بہاریں دیکھ لی ہیں ان بہاروں میں انہوں نے اپنے تخلیقی کارواں کو مستقل اور بے تکان انداز میں ہم دوش سفر رکھا۔ چنانچہ خدائے تعالیٰ کے فضل وکرم سے مختلف اداروں کی طرف سے انہیں اعزاز واکرام سے نوازا گیا ہے۔ ان کی مختلف کتابوں پر اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش اور کرناٹک اُردو اکیڈیمی سے انہیں ایوارڈس حاصل ہوئے۔

☆ مجموعی خدمات کے سلسلہ میں "آل انڈیا میر اکیڈیمی لکھنو" سے "امتیاز میر ایوارڈ" سے 1997ء میں نوازا گیا۔

☆ 2001ء میں انٹرنیشنل میان آف دا ئیر ایوارڈ کے مستحق قرار پائے۔

☆ کرناٹک اردو اکیڈیمی بنگلور نے آپ کو 2008ء میں مجموعی خدمات " برائے غزل ایوارڈ "عنایت کیا۔

☆ 2010ء میں نعتیہ شعری خدمات کے ضمن میں حمد ونعت اکیڈیمی دہلی نے حضرت حسان ایوارڈ سے اعزاز بخشا۔

☆ کوئمبتور سے " الطاف حسین حالی ایوارڈ " بھی آپ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔

☆ 2013ء میں نعتیہ شعری خدمات کے زیرِ عنوان حیدرآباد کے ادارۃ الانصار نے آپ کو الانصار ایوارڈ سے سرفراز کیا۔

☆ تحقیق وتنقید کے عنوان پر 2013ء میں ٹملناڈو اردو پبلی کیشن (چنئی) نے آپ کو " علامہ باقر آگاہ " ایوارڈ عطا کیا۔

☆ سہ ماہی دبستان کڈپہ اور ودیا نگر ایجوکیشن ٹرسٹ کے "تحسین فن " ایوارڈ سے آپ کو 2013ء میں نوازا گیا۔

☆ جشن جمہوریہ ہند کے پر مسرت موقعہ پر مجموعی ادبی خدمات کے عوض "گورنر آف کرناٹک ایوارڈ " سے ریاست کرناٹک نے آپ کو سرفراز کیا۔

☆ کمال صاحب ساوک ہندی بھون کڈپہ کا " امیر خسرو ایوارڈ (2014ء) برائے مجموعی ادبی خدمات۔

☆ مجموعہ مضامین" مدرکات" پر کرناٹک اردو اکیڈیمی بنگلور کا انعام (2015ء)

ڈاکٹر راہی فدائی کی ادبی شعری خدمات ہمہ جہت ہیں دریا کی روانی کی طرح آپ کا تخلیقی عمل آج بھی رواں دواں ہے آپ کی تہہ دار شخصیت سے کئی ریسرچ اسکالرز نے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں راہی فدائی پر کئی تحقیقی مقالے لکھے گئے ہیں۔ .Ph.D اور M.Phil پر یونیورسٹیوں میں کام ہوا ہے۔

ا - Ph.D کے تحقیقی مقالے

(1) مولانا راہی فدائی حیات اور کارنامے
مقالہ برائے - .Ph.D
مقالہ نگار - ایس. ایوب احمد باقوی
ڈاکٹر بی. آر. امبیڈکر بہار یونیورسٹی، مظفر پور - 1998ء
(2) رائلسیما آندھرا پردیش میں اردو شعروادب کا ارتقاء آزادی کے بعد

مقالہ برائے - Ph.D.

مقالہ نگار - سید سلطان معین الدین حسینی

سینٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد- 2004ء

(3) رائلسیما میں اردو نثر آزادی کے بعد

مقالہ برائے - Ph.D.

مقالہ نگار - ایس.رضیہ بیگم

ایس.وی. یونیورسٹی، تروپتی - 2005ء

(4) رائلسیما میں اردو ادب کے عناصر خمسہ

مقالہ برائے - Ph.D.

مقالہ نگار - عرفانہ بیگم

ایس.وی. یونیورسٹی، تروپتی - 2016ء

ب - ایم - فل کے تحقیقی مقالے

(1) ڈاکٹر راہی فدائی کی نعتیہ شاعری

مقالہ برائے - ایم فل.

مقالہ نگار - محمد اسلام کوثر

سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد - 2012ء

(2) منتخبہ اردو غزلوں کا تنقیدی جائزہ (رائلسیما کے حوالے سے)

مقالہ برائے - ایم فل.

مقالہ نگار - جی. بی. عائشہ

سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد - 2012ء

(3) ڈاکٹر راہی فدائی بحیثیتِ شاعر

ڈاکٹر راہی فدائی بحیثیتِ نثر نگار

مقالہ برائے - ایم فل.

ایس.وی. یونیورسٹی، تروپتی

شاعری کے علاوہ ڈاکٹر راہی فدائی کا خاص میدان تحقیق ہے۔ راہی فدائی ایک محقق کی حیثیت سے اپنے آپ کا ادبی دنیا سے تعارف کرا چکے ہیں۔ ایک محقق میں جتنی خوبیاں ہونی چاہئے وہ تمام خوبیاں آپ میں موجود ہیں۔ ان کی تحقیق علمی اداروں اور شخصیتوں کے بارے میں بڑی مدلل اور حقائق پر مبنی ہے۔ شخصیات کی خاکہ نگاری میں راہی فدائی نے حتی الامکان تمام گوشوں کا معائنہ کیا ہے جو باتیں اپنی فوری رسائی میں تھیں ان کو لیتے ہوئے رسائی سے باہر کی پوری کھوج کی ہے یہ دوسرا عمل ہی محقق کو صحیح معنوں میں محقق بناتا ہے ورنہ تحقیق ادھوری قرار پاتی ہے۔

راہی فدائی کا تعلق مدرسۂ باقیات الصالحات ویلور سے بہت گہرا رہا ہے۔ اس سلسلے میں آپ نے پورے خلوص کے ساتھ شخصیات باقیات الصالحات کا پورا احاطہ کیا ہے۔ چونکہ ایک طویل مدت ویلور میں گذارنے کے باعث ویلور ہی کے ایک اور عظیم علمی ادارے دارالعلوم لطیفیہ ویلور کے ساتھ آپکی گہری وابستگی رہی ہے۔

ویلور میں لطیفیہ اور باقیات کے درمیان کئی طرح کے اٹوٹ روابط ابتداء سے آج تک قائم ہیں۔ راہی فدائی نے اپنی ذمہ داری سمجھی کہ وہ دارالعلوم لطیفیہ پر بھی اپنا قلم اٹھائیں۔ 1997ء میں آپ نے اس موضوع پر تحقیقی مقالات لکھے ہیں جو ''دارالعلوم لطیفیہ ویلور کا ادبی منظر نامہ'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔

راہی فدائی کا وطن کڈپہ رہنے کی وجہ سے اس سلسلے میں انہوں نے ''کڈپہ میں اردو'' کے نام سے ایک تحقیقی کتاب علمی و ادبی دنیا کو سونپی ہے اس کتاب میں آپ نے 1710ء تا 1957ء کے دور کا احاطہ کیا ہے۔ یہ کڈپہ کے تعلق سے ان کی پہلی کڑی ہے۔

''مسلکِ باقیات'' راہی فدائی کی تحقیق تو نہیں البتہ اس ادارے کی ایک خاصیت کا تعارف ہے۔ ویلور ہی کے تعلق سے راہی فدائی نے ایک مختصر سا کتابچہ بھی پیش کیا ہے جو مختصر ہونے کے باوجود کوزے مین سمندر کو بند کرنے کے مترادف ہے۔ اس کتابچہ کا نام ''ویلور تاریخ کے آئینہ میں'' ہے۔ اس تالیف کی لوگوں کو بہت ضرورت تھی جس کو راہی فدائی نے پورا کیا ہے۔

ویلور اور کڈپہ سے ہٹ کر راہی فدائی نے گلشن گلشن سے پھول جمع کر کے ایک تصنیف کی ہے۔ جو ''اکتسابِ نظر'' کے نام سے موسوم ہوئی اس سے ان کی تحقیقی بصیرت اور ان کے عنوان سے تنقیدی شعور نمایاں ہوتا ہے۔

اوراقِ جاودان 1993ء میں حکیم محمد نور الحق جاوید کے نام ایک کتاب مرتب ہوئی۔ اسکے مرتبین راہی فدائی اور نظام

الحق عابد ہیں۔

مذکورہ بالا کاوشوں کے علاوہ راہی فدائی نے صفیر '' سالنامۂ باقیات الصالحات'' کے مدیر کی حیثیت سے صحافتی پہلو کو اپنایا ہے اور بڑی حد تک اس کی ترتیب و تدوین اور اشاعت و طباعت کی ذمہ داریاں نبھائی ہیں۔

ایک محقق کو اچھا نثر نگار بھی ہونا لازمی ہے۔ راہی فدائی کی نثر نگاری ان کے اپنے اسلوب کی ہے۔ صاف اور شستہ اظہار قاری کی دلچسپی کو برقرار رکھتا ہے۔

راهی فدائی کی نثری تصنیفات

باقیات ایک جهاں: 1980ء میں شائع شدہ یہ کتاب راہی فدائی کا تاریخی کارنامہ ہے جس کو مرتب کر کے انہوں نے باقیات الصالحات کی دینی اور ادبی خدمات کو ہمیشہ کیلئے محفوظ کر دیا ہے۔

تجزیه : 1988ء میں شائع ہوئی شاہ عبدالوہاب صاحب قادری (باقیات الصالحات کے بانی) کے بارے میں غلط تاریخ نگاری سے کام لیتے ہوئے خطیب عبدالمجیب صاحب نے ایک کتاب تصنیف کی تھی ڈاکٹر راہی فدائی کی کتاب تجزیہ دراصل اس کے جواب میں لکھی گئی ہے اس کتاب میں موصوف نے نہ صرف خطیب صاحب کی غلط تاریخ نگاری کا مدلل تجزیہ کیا ہے بلکہ صحیح تاریخ کی نشاندہی بھی کی ہے۔

مسلک باقیات : 1991ء میں شائع ہوئی جس کی ابتداء راہی فدائی نے لفظ مسلک کے معنی و مفہوم کی تشریح اور وضاحت سے کی ہے اور آگے چل کر باقیات الصالحات کی چند بزرگ و برگزیدہ ہستیوں کے مسالک اور ان کے عقائد پر بحث کی ہے۔

اکتساب نظر : کا سنہ اشاعت 1991ء ہے۔ یہ راہی فدائی کے تحقیقی اور ادبی مضامین کا مجموعہ ہے ان کے مضامین میں قدیم شاعر ولی ویلوری کے ساتھ ساتھ ساغر جیدی اور علیم صبا نویدی جیسے جدید شاعروں پر بھی موصوف نے اظہار خیال کیا ہے۔ یہ تصنیف راہی فدائی کی تحقیقی بصیرت اور ان کے تنقیدی شعور کو نمایاں کرتی ہے۔ اس کتاب کے ابتدائی مضامین موضوعاتی اعتبار سے تحقیقی ہیں۔ آخری مضامین جنوب کے دو جدید و مقبول شعراء سے متعلق ہیں۔

کڈپه میں اردو : راہی فدائی صاحب کی ایک اور تصنیف '' کڈپہ میں اردو'' 1992ء میں شائع ہوئی۔ ان کی تحقیق و تدوین کی اہم ترین تصنیف ہے۔ اس کا انتساب انہوں نے '' جناب شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر محمد علی اثر اور اپنے یارِ غم خوار جناب عقیل جامد'' کے نام کیا ہے۔ یہ کتاب 1710ء تا 1957ء کے زمانے کا احاطہ کرتی ہے اس کتاب کے مقدمہ میں جناب ایس. ایوب احمد باقوی (ایم. اے.) رقمطراز ہیں:

'' حضرت راہی فدائی کی یہ معرکہ آرا پیش کش '' کڈپہ میں اردو'' کئی اعتبار سے قابلِ دید اور لائق داد و تحسین ہے۔ اس کتاب میں جملہ اکیس شعراء کا تذکرہ شامل کیا گیا ہے جس مین قدیم ترین شاعر محمد ابن رضا، مترجم قصیدہ بردہ اور سب سے آخر میں لعل خاں ادیب کڈپوی ہیں۔ گویا مولانا راہی فدائی نے تقریباً 300 سالہ ادبی تاریخ کے تانے بانے جوڑے ہیں اور کئی گمشدہ کڑیوں کو دریافت کر کے انہین اگلے پچھلے حلقوں کے ساتھ جوڑ کر سلسلۃ الذہب کی صورت میں پیش کیا ہے۔''

اوراقِ جاوداں : (1993ء) راہی فدائی اور نظام الحق عابد دونوں کی ترتیب دی ہوئی کتاب ہے یہ کتاب دراصل مخطوطہ مشاہیر عظام کلیم نور الحق جاوید کے نام ہے۔ راہی فدائی نے اپنے ایک مضمون '' خطوط نگاری'' میں خطوط نگاری کی اہمیت اور اس کی دلچسپیوں کا ذکر کیا ہے۔ راہی فدائی کی یہی دلچسپی '' اوراقِ جاوداں'' کی ترتیب میں اجاگر ہوئی ہے۔ عرضِ مرتب کے طور پر راہی فدائی نے اس کتاب کا ایک بھرپور خاکہ پیش کر دیا ہے۔

اس کتاب میں حکیم محمد نور الحق جاوید کے نام مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا عبدالماجد دریابادی، بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق، ڈاکٹر ذاکر حسین وغیرہ اکابر علم و ادب کے لکھے ہوئے خطوط ہیں۔ '' عرضِ مرتب'' کے علاوہ اس کتاب میں تذکرۂ جاوید کے عنوان سے راہی فدائی نے ہی ایک تعارفی مضمون بھی سپرد قلم کیا ہے جو از حد ضروری ہے۔ اس لئے کہ قاری کو پتہ چلے کہ آخر حکیم محمد نور الحق جاوید کی شخصیت کیا تھی؟ انہوں نے جو تعارف کرایا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ حکیم محمد کون ہیں؟

اس کتاب کی ایک اہم خاصیت یہ ہے کہ اس کے صفحات پر ہر جگہ راہی فدائی صاحب نے ہی ضروری فُٹ نوٹس لکھے ہیں۔

مدرسۂ باقیات الصالحات کے علمی و ادبی کارنامے :

1994ء میں شائع ہوئی یہ کتاب راہی فدائی صاحب کی ایک اہم ترین تصنیف ہے۔ ''مدرسۂ باقیات الصالحات کے علمی و ادبی کارنامے'' ویلور کے بزرگ شاعروں اور ادیبوں کی حیات اور ان کے ادبی کارنوموں پر محیط ہے۔ اس حیثیت سے یہ کتاب ایک ''تذکرہ'' بھی کہی جاسکتی ہے۔ مولانا راہی فدائی نے اپنی اس تصنیف پر کسی سے تقریظ پیش لفظ یا تعارف نہیں لکھوایا ہے۔ جب کہ یہ ایک اہم ترین تصنیف ہے۔

ویلور تاریخ کے آئینے میں :

1997ء میں شائع ہوئی۔ جس میں راہی فدائی نے بعض تاریخی حقائق کی روشنی میں شہر ویلور کی عظمت کو ثابت کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ مؤلف اس کتاب میں ایک مؤرخ کی حیثیت سے روشناس ہوئے ہیں۔ راہی فدائی اور ویلور، دو لازم و ملزوم نام ہیں۔ ویلور جو ہر حیثیت سے راہی ساز شہر رہا ہے۔ کیوں کر نہ راہی فدائی کے اثرِ خامہ میں نہ آتا۔ راہی فدائی کی تحقیقی صلاحیت پوری طرح عروج پر آ گئی تھی ان کی نظر باریک بین ہوگئی تھی آپ ایک بات کو مختلف زاویوں سے دیکھنے کی بجائے صحیح زاویے سے اس کی تہہ کو پہنچنے میں مہارت رکھتے ہیں کوئی بھی موضوع راہی فدائی صاحب کو اپنی طرف مائل کرلیتا ہے۔ راہی فدائی نے یہ کتاب بڑی محنت سے ترتیب دی ہے۔ مختلف مؤرخین کی کتابوں سے ماخود باتوں کی کڑیاں ملا کر ایک تسلسل پیدا کیا ہے۔ یہ کتاب مفصل تاریخ نہیں ہے۔ بلکہ بڑی تیزی سے واقعاتی کڑیوں کو جوڑ کر ایک اجمالی تاریخ لکھی ہے۔

دار العلوم لطیفیہ ویلور کا ادبی منظر نامہ :

راہی فدائی کی جدید ترین تصنیف ہے اس کا سنہ اشاعت 1997ء ہے۔

راہی فدائی صاحب کی یہ تصنیف بھی اتنی ہی عظیم ہے جتنی باقیات صالحات سے متعلق تصنیف ہے۔ راہی فدائی صاحب کی وجہ سے اہلِ زبانِ اردو ویلور کی علمی و ادبی اہمیت سے روشناس ہو رہے ہیں یہ موصوف کا عظیم ترین کارنامہ ہے اس سے پہلے یہ تمام واقعات چیدہ چیدہ اوراق میں تھے کہ سب کو ایک جگہ کر کے پیش کرنے سے ان واقعات کا مزید انتشار رک گیا ہے۔ غیر مطبوعہ ماخذات بھی ان تصانیف میں جگہ پا کر مزید اضافہ کا باعث ہوئے ہیں۔ اس کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے اس کا پہلا حصہ دینی مدارس کے سیاسی اور سماجی پس منظر کو پیش کرتا ہے اور دوسرے حصے میں دار العلوم لطیفیہ کے مقتدر عالموں، شاعروں اور ادیبوں کے حالاتِ زندگی اور ان کے عملی کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اس کتاب کا تعارف ''ڈاکٹر محمد علی اثر نے لکھا ہے'' وہ لکھتے ہیں:

''پیش نظر کتاب میں مدرسۂ لطیفیہ کے 20 فارغ التحصیل اہلِ علم کا تذکرہ شامل ہے۔ اس خصوص میں ڈاکٹر راہی فدائی نے مختلف دلائل اور شواہد کی روشنی میں مدرسۂ لطیفیہ سے متعلق تمام علماء شعراء اور مصنفین کے حالاتِ زندگی اور ان کے علمی و ادبی کارناموں کا سیر حاصل جائزہ لیا ہے۔''

حضرات ویلور سے شروع کر کے راہی فدائی صاحب نے قارئین لطیفیہ تک جتنے بھی قد آور شعراء ادباء گذرے ہیں ان کا جائزہ لیا ہے۔ انکے دسترس میں جو بھی چیز تھی اسے امانت داری کے ساتھ سپرد قرطاس کردیا ہے۔

جوئے شیر : (2000ء) راہی فدائی کی تصنیف جوئے شیر علمی و تحقیقی ادبی مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ کتاب پندرہ مضامین پر مشتمل ہے دس مضامین نوعیت کے اعتبار سے علمی اور تحقیقی ہیں اور باقی پانچ تبصروں اور تاریخی تحریروں پر مبنی ہیں۔

قلم رو فکر (2002ء) میں شائع ہوئی : ''ڈاکٹر راہی فدائی کے مضامین و مقالات کا مجموعہ ہے جو مختلف سیمناروں ادبی حلقوں اور رسم اجراء کی تقاریب میں پڑھے جاچکے ہیں ان میں سے بعض مضامین ملک کے مؤقر ادبی رسائل و جرائد کی زینت بھی بن چکے ہیں اور بعض مضامین مختلف کتب میں مقدموں اور تعارف ناموں کی شکل شائع ہوچکے ہیں۔

نقوش بلند فکر : 2005ء (مرتبہ) راہی فدائی

علیم صبا نویدی کے مضامین کی ترتیب وتہذیب

چہرہ چہرہ روشن : 2006ء(مرتبہ) راہی فدائی

علیم صبا نویدی کے مضامین کی ترتیب وتہذیب

قدیم ہندوستان میں علوم دین کے سر چشمہ : 2009ء کی یہ تصنیف راہی فدائی کے اچھے مترجم ہونے کی دلیل پیش کرتی ہے جس میں انہوں نے اپنی تحقیقی صلاحیتوں کو بروئے کارلاتے ہوئے تحقیقی نقطۂ نظر سے وطن عزیز میں علمِ دینیات کے جن سر چشموں کا جائزہ لیا ہے وہ یقیناً تاریخی کارنامہ ہے اور ایک ایسی قیمتی دستاویز ہے جسکی روشنی میں نسل نوع اپنے وجود کا اندازہ کرسکتی ہے اس معلوماتی اور مفید کتاب میں عالم اسلام کا اولین جدید مدرسہ، مدرسہ بہقیہ (پانچویں صدی ہجری) سے لیکر''روضۃ العلوم عربک کالج فاروق'' کالی کٹ کیرلا قائم شدہ 1942ء تک تقریباً ایک سودس مدارس جامعات اور دارالعلوم کا ایک خوبصورت اجمالی تذکرہ کیا گیا ہے۔

حیدرآباد کا شعر و ادب : 2009ء(مرتبہ) راہی فدائی (علیم صبا نویدی کے مضامین کی ترتیب وتہذیب)

استشہاد : (2012ء) تحقیقی وعلمی مضامین کے اس مجموعہ میں راہی فدائی صاحب نے ایک تاریخ کو پیش کیا ہے اور 36 مضامین ومقالات انہوں نے لکھے ہیں۔ پہلے باب میں اساطین علم وحکمت کے عنوان سے انہوں نے حضرت ابوعبیدہ عامر بن جراحؓ سے لیکر مختلف علمائے دین علامہ فدوی باقویؒ تک کا ذکر کیا ہے۔

دوسرے باب میں نابغہ شعر وسخن کے زیرے تحت مختلف مثنویوں کا ذکر کیا ہے جس میں مثنوی چندر بدن مہیار، رتن پدم، پھول بن وغیرہ کا ذکر انوکھے انداز میں کیا ہے۔

باب سوم میں انہوں نے تحقیق کے عنوان کے تحت نصرتی دیوان مذہب جانِ جانان کا مطبوعہ نادر نسخہ ویلور میں رباعی تیسری صدی ہجری میں سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے جو قابل تحسین ہے۔

باب چہارم میں حیرت کدہ ادب میں ڈاکٹر عبدالحق کی علمی ودینی خدمات علامہ اقبالؒ کی نفسیات جیسے مضامین کو قلم بند کیا ہے۔

پانچواں باب میں شواہد تاریخ میں مدارس کے تاریخی پس منظر کو تفصیل سے پیش کیا ہے۔

مدرکات : (2013ء) کی تصنیف ہے جس میں راہی فدائی نے اردو غزل میں اخلاقی اقدار کے بارے میں گرانقدر مدلل انداز میں بحث کی ہے یہ مختلف نثری اور شعری تصانیف پر تاثرات کی شکل میں ہے۔ بصارت سے بصیرت تک تحقیقی کارنامے اور بہت سے مشہور ادبی شخصیتوں کا انہوں نے بڑے دانشوارانہ انداز میں ذکر کیا ہے۔

باقیات ایک جہاں : (2013ء) راہی فدائی صاحب کی تصنیف''باقیات ایک جہاں'' میں ابتداء سے لیکر حال تک انہوں نے بڑے مدلّل انداز میں قلم اُٹھایا ہے۔ اورانہوں نے یہ بتایا ہے کہ وہاں کے لائق وقابل اساتذہ اور شائستہ مہذب طلباء اور علم دین کے ذوق سے بہرہ ور ہو رہے ہیں انکا اور مدرسہ کے کتب خانہ کا جو اساتذہ اور طلباء کی تعلیمی ضرورت اوران میں ذوق مطالعہ پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے۔ طلباء کی اخلاقی نگرانی اورانتظامی اموراطمینان بخش طریقہ کار کو اساتذہ وطلبہ کی موجودہ زمانے کی دینی اور دنیاوی ضرورتوں سے باخبری اوراُن کی تعمیری صلاحیتوں کا بھی ذکر کیا ہے۔

مصدقات : (2015ء) راہی فدائی کی تصنیف مصدقات ایک تحقیقی وعلمی ادبی مضامین کا مجموعہ ہے جس میں انہوں نے علم و ادب اور بزرگانِ دین کی شخصیتوں کا ذکر اوراُن کے تاریخی پس منظر اور مختلف مضامین کو پیش کیا ہے۔

خانقاہ اقطاب ویلور کے علمی آثار : (2016ء) راہی فدائی کی یہ تصنیف خانقاہِ اقطاب ویلور کے علمی آثار کو پیش کرتی ہے۔ جنوبی ہند کے فروغ میں خانقاہِ ویلور کا علمی حصہ رہا ہے۔ اس مین انہوں نے ویلور کے مدرسہ باقیات الصالحات کے عالموں کا ذکر کیا ہے۔ ویلور شہر کی علمی اورادبی زندگی کے حوالے سرسری نوعیت کے ہیں۔ راہی فدائی صاحب نے اس شہر کی علمی وادبی تاریخ کے مبسوط مطالعے کئے ہیں۔ یہاں کی علمی اورادبی تاریخ کے ربط کو مرتب کیا ہے۔''خانقاہِ اقطاب ویلور'' سے مسلک علماء واساتذہ اوران سے مستفیض مشاہیر علم وادب کی خدمات کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ اس ادارے کا قیام دوصدیوں سے زیادہ عرصہ پر مشتمل رہا۔ شاید پہلی بار راہی

صاحب کی تصانیف کے ذریعہ علمی دنیا متعارف ہوئی ہے یا ہو رہی ہے۔
Glimpses History: راہی فدائی کی یہ تصنیف 2016ء میں شائع ہوئی۔
شواہد : راہی فدائی کی یہ تصنیف 2017ء میں شائع ہوئی ہے اس میں انہوں نے تحقیقی و علمی مضامین کو اکیجا کر کے کتابی شکل دی ہے۔اس میں دس مضامین شامل ہیں۔
مرثیۃ الحق : مئی 2018ء کو شائع ہوئی ہے۔اس کے حضرت علامہ حکیم شاہ زین العابدین مائل واذع ویلوری ہیں۔اس کتاب کی تحقیق و تسہیل ڈاکٹر راہی فدائی نے کی۔اس کتاب کا مقطوطہ تقریباً دو صدیوں تک پیشتر رائج قدیم اُردو (دکنی) زبان میں تحریر شدا تھا۔جس سے آج استفادہ کیا گیا ہے۔راقم الحروف راہی فدائی نے اس قدیم زبان کو جدید اُردو میں تبدیل کیا۔
علاقے کڈپے کے نایاب تاریخی کتبے : اس کتاب کو ڈاکٹر راہی فدائی صاحب نے 2018ء میں شائع کیا۔
ادبیات ویلور : ادبیاتِ ویلور 2018ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کے مصنف ڈاکٹر راہی فدائی صاحب ہیں یہ کتاب تحقیقی و علمی مضامین کا مجموعہ ہے۔
علاقے کڈپہ کے نایاب تاریخی کتبے : 2019ء میں راہی فدائی کی یہ کتاب شائع ہوئی۔ اس کتاب میں انہوں نے علاقہ کڈپہ کے نایاب تاریخی کتبے "تصنیف کر کے ایک تاریخی کارنامہ انجام دیا ہے۔کتبوں کی قرات ایک انتہائی مشکل امر ہے ۔راہی فدائی اردو کے ساتھ ساتھ عربی اور فارسی سے بھی بہت اچھی واقفیت رکھتے ہیں "کتبہ" سے مراد وہ عبارت ہے جو قبروں، مسجدوں اور سرایوں وغیرہ کے دروازوں پر لکھوا کر یا کھدوا کر لگائے جاتے ہیں۔
جنوب کے اصحاب کمال، جلد اول : راہی فدائی کی یہ کتاب 2019ء میں شائع ہوئی۔راہی فدائی نے جنوب کے اصحابِ کمال کے علمی اور ادبی کارناموں کا تحقیقی جائزہ لیا۔

جنوب کے اصحابِ کمال، چوہتر (74) مضامین پر محیط ہے۔ یہ سارے نہایت دیدہ وری، دیدہ ایزی کی کوشش سے لکھے ہیں ان میں شعراء وادبا کے کارناموں اور علمی وادبی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ان میں سے بیشتر اہل قلم رائل سیما کے علاقے (کڈپہ، کرنول) سے تعلق رکھتے ہیں باقی کا تعلق علاقہ کرناٹک سے ہے۔

ڈاکٹر راہی فدائی نے اس کتاب کو بجا طور پر" جنوب کے اصحابِ کمال" کا نام دیا ہے۔جن شخصیات کو اس کتاب میں موضوع بحث بنایا گیا ہے۔وہ اشعار تا آسمان علم وادب کے تاباں و درخشاں نجوم و کواکب ہیں جو ابر نیساں کی اوٹ میں چلے گئے تھے۔ اور زمانے کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکے تھے۔ڈاکٹر راہی فدائی نے انہیں مطلع تحقیق پر نمودار کیا ہے۔
جنوب کے اصحاب کمال، جلد دوم : یہ کتاب 2019ء میں ہی شائع ہوئی ہے اس کتاب میں پہلے حصے سے متاثر دوسرا حصہ لکھا ہے۔ راہی فدائی کا مقصد تھا۔ جنوب کے جتنے بھی اصحاب جو گم شدہ ہیں انکو اوجھل ہونے نہیں دیا بلکہ اپنی کاوش اور کوششوں سے انہیں تحقیق کے آئینہ میں نمودار کیا ہے اس میں راہی فدائی کی محنت لگن جستجو کی تعریف کتنی بھی کرے، بہت ہی کم ہے۔

راہی فدائی نے تحقیقی نتائج بر آمد کرنے میں کبھی جلد بازی نہیں کی جو ایک اچھے باشعور محقق کی خوبی ہے۔انکے فنِ تحقیق میں مذہبی طرز کی جھلکیاں بھی محسوس کی جا سکتی ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی شخصیت کی تعمیر اور ان کی تعلیم کا پس منظر اور پیش منظر مذہبی ہے۔انہوں نے تحقیق وتنقید وتالیف کے بہت سے کام کئے ہیں۔راہی فدائی بیک وقت شاعر، ادیب، محقق، مورخ اور نقاد ہیں اور ان کا ادبی سفر کم وبیش چار دہوں پر محیط ہے۔

ڈاکٹر راہی فدائی جہاں بلند پایہ عظیم المرتبت ادبی حلقہ کے ممدوح ہیں۔وہیں عوام الناس میں بھی آپ کی علمی صلاحیتوں کا بول بالا ہے۔چوٹی کے ادباء و شعراء عوام کے ہر طبقہ سے آپ کا تعلق اور ربطہ وضبط ہے۔آپ باذوق، خوش پوشاک، خوش گفتار، متواضع، ملنسار شخصیت کے مالک ہیں۔بلاشبہ راہی فدائی کی یہ وہ صفات ہیں جو انہیں بہت سے اہلِ علم، اہلِ قلم اور اربابِ دانش وفکر سے ممتاز کرتی ہیں۔آپکی علمی دینی فکر اور ادبی خدمات یقیناً بے لوث ہیں۔ راہی فدائی نام ونمود کے جذبے سے بہت دور ہیں۔

عطیہ نفیس ۔ایم اے۔بی ایڈ، حیدرآباد

میرؔ شخصیت وشاعری

اردو ادب میں میرؔ ایک ایسی قدآور عظیم شخصیت کا مالک ہے، جس کو ہر باکمال شاعر اور صاحب فن نے بلالحاظ دور وعصر عقیدت کے نذرآنے پیش کیئے ہیں، اس نے اپنے زمانے میں بھی اپنی عظمت کا لوہا منوایا اور بعد میں بھی ہر ایک دور کے استادِان فن خراج تحسین حاصل کیا۔ میرؔ کے کلام کی طرح ان کی شخصیت اور بلند کرداری بھی قابل احترام رہی ہے۔ میرؔ کی خودداری، توکل اور قناعت قابل ستائش ہے۔ انھوں نے نااہلوں کے سامنے کبھی سر نہیں جھکایا۔ کبھی لالچ سے یا مفلسی کے دکھ سے خلاف ضمیر کوئی کام نہیں کیا مولانا محمد حسین آزادؔ آب حیات میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔ میرؔ صاحب کی بلند نظری اس غضب کی تھی کہ دنیا کی کوئی بڑائی اور کسی شخص کا کمال یا بزرگی انھیں بڑی نہ دکھائی دیتی تھی۔ اس صباحت نے نازک مزاج بنا کر ہمیشہ دنیا کی راحت اور فارغ ابالی سے محروم رکھا۔ اور وہ وضعداری اور قناعت کے دھوکے میں اسے فخر سمجھتے رہے۔

لکھتے ہیں کہ:۔

"سب تذکرے نالاں ہیں۔ کہ اگر یہ غرور اور بے دماغی فقط امراء کے ساتھ ہوتی تو معیوب نہ تھی۔ افسوس یہ ہے کے اوروں کے کمال تھی انہیں دکھائی نہ دیتے تھے اور یہ امر ایسے شخص کے دامن پر نہایت بدنما دھبا ہے۔ جو کمال کے ساتھ صلاحیت اور نیکوکاری کا خلعت پہنے ہو۔"

یہ بات بھی بڑی عجیب ہے کہ میرؔ جہاں اپنی اس اعلیٰ وار رفع سیرت کے اعتبار سے اپنے معاصرین میں ممتاز ہیں اور نازک مزاجی کی وجہ سے بعض کوتاہوں کے لیے مورد الزام بھی ٹھہرے میر کی بے نیازی، کم آمیزی، بے تعلقی اور بے دماغی کی عام شکایا تیں ہیں، لوگوں نے میر کی اس مخصوص ذہنی روش وان کے کبر وغرور سے تعبیر کیا ہے۔ میرؔ کی زندگی کے حالات کا مدوجذر اور ان کی شخصیت کا نشیب وفراز اُن کی شاعری کو سمجھنے میں بہت مدد دیتا ہے۔ کہ وہ درحقیقت اسی کا، ایک عکس ہے۔ میرؔ پر جو کچھ بیتی، جن حالات میں سے ہوکر انھیں گذرنا پڑا، جو سانحات انھیں پیش آئے۔ جن شخصیتوں کے زیر سایہ ان کی نشوونما ہوئی۔ اور جن معاملات وسائل سے انھیں دوچار ہونا پڑا، ان سب کا اثر ان کی شاعری میں موجود ہے، ان کی شاعری ان سب کا ایک ایسا آئینہ ہے ۔۔ جس میں ان حالات اور معاملات وسائل کی تفصیل وجذئیات تک کو دیکھا جاسکتا ہے۔ دس سال کی عمر میں باپ چل بسے، سوتیلے بھائیوں نے باپ کے مرنے کے بعد بدسلوکیاں شروع کردیں۔ میرؔ نہایت نازک مزاج تھے۔ سوتیلے بھائیوں کی بدسلوکی کی وجھہ سے آگرہ چھوڑ کر دلی گئے، یہاں بھی میرؔ کو چین سے بیٹھنے نہیں دیا۔

اپنا ہی ہاتھ سر پہ رہا اپنے یاں سدا
مشفق کوئی نہیں ہے کوئی مہرباں نہیں

حافظ محمد حسن نے آرزو خط لکھا کہ

" میرؔ تقی فتنہ روزگار ہے۔ اس کی تربیت ہر گذ نا

کریں بل کے دوستی کے پردے میں کام تمام کردینا چاہیئے"۔

اتنا لکھنا تھا آرزو کی بدسلوکیاں میر کے ساتھ بڑھتی گئیں میر نے ان کی بدسلوکیوں کا ذکران الفاظ میں کیا ہے۔

" وہ عزیز (آرزو) پکے دنیا دارت تھے۔ اپنے
بھانجہ کی عداوت دیکھ کر میر اُبر اچاہنے لگے۔
اگر میں سامنے سامنے پڑتا تو پھٹکارنے لگتے اور بچ
بچ کر رہتا تو اول فول بکتے۔
دشمنوں، کا سا برتاؤ کرتے، میں کیا بیان کروں کہ ان
سے کیا سلوک دیکھا۔
اور کس طرح کہوں کیا رنج اُٹھائے، ہر چند صبر وضبط
کرتا اور لاکھ احتیاج ہو
مگر ان سے ایک روپیہ بھی نہ مانگتا تھا۔
"(افکارِ میر)

یہی وجہ ہے کہ میر کی شاعری زندگی کے تلخ حقائق کی ایک داستان ہے۔ ان کے یہاں درد وغم کے گہرے نقوش ملتے ہیں۔ جن معاشرتی حالات میں میر کی شخصیت کی تعمیر ہوئی، ایسی درماندگی، مایوسی، اور بے بسی کا ذکر انھوں نے اپنے اشعار میں جا بجا کیا ہے۔ اس لئے میر کی آواز سب سے الگ پہچانی جاتی ہے۔ بقول۔ مولوی عبدالحق:۔

" میری رائے میں کسی شاعر کے کلام کا ایک بڑا
معیار اس کے کلام کی تاثیر ہے۔
اگر اس معیار پر میر صاحب کا کلام جانچا جائے تو ان
کا رتبہ اردو شعراء میں سب سے اعلا پایا جاتا ہے"۔

اُن کے اشعار سوز وگداز اور درد کی تصویریں ہیں، زبان سے نکلتے ہی دل میں جا کر بیٹھ جاتے ہیں، میر کی شاعری عظمت کا اس سے بہتر ثبوت نہیں مل سکتا۔ انھوں نے شعر کے پردے میں اپنے غموں کی داستان جس انداز سے بیان کی ہے۔ وہ انداز دوسرے کسی شاعر کے یہاں نہیں ملتا۔ میر کا انداز اپنا انداز ہے، اور ان کا یہ انداز کوئی نہیں اپنا سکتا۔

میر خود فرماتے ہیں۔

ہر صبح غموں میں شام کی ہے میں نے
خونابہ کشی مدام کی ہے میں نے
یہ مہلت کم کہ جس کو کہتے ہیں عمر
مرمر غرض تمام کی ہے میں نے

شعر کے پردے میں نے غم سنایا ہے بہت
مرثیے نے دل کے میرے بھی رُلایا ہے بہت

اردو ادب کے پورے سرمائے کا جائزہ لیا جائے تو میر کے علاوہ ہمیں کوئی اور ایسا شاعر نہیں ملتا جس کی عظمت کا اعتراف ہر دور میں یکساں طور پر کیا گیا ہو، وہ ادبی وارتقاء کی مضبوط کڑی ہیں، انھوں نے صرف اپنے زمانے ہی کے ادب پر نقش نہیں چھوڑا بل کے مستقبل کی گذرگاہوں کو بھی روشن کردیا ہے۔ میر کی زندگی حسرت کا مجسمہ اور مایوسی کا مرقع تھی۔ ایسی حسرت اور مایوسی نے جھلک کر اُن کی شاعری کی صورت اختیار کی کرلی ہے۔ اسی لئے وہ خود بھی حسرت کا مجسمہ اور مویوسی کا مرقع معلوم ہوتی ہے۔ ان کے سارے کلام میں سوز وگداز اور نشتریت کی جو ایک لہر سی دوڑی ہوئی نظر آتی ہے۔ وہ بھی صورت حال کی پیداوار ہے۔ میر کی یہ شاعری، جو درد وغم اور رنج والم کی ترجمانی اور عکاسی کے باعث سوز گداز اور نشتریت سے بھرپور ہے۔ اداس ضرور کرتی ہے۔ لیکن اس میں گھٹن گا احساس نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ اس میں دلچسپی لی جاسکتی ہے۔ اس سے غم غلط کیا جاسکتا ہے۔ وہ زخمی دلوں کے لئے نشتر نہیں بل کے

مرہم ہے۔ میرؔ کی شاعری میں اس خصوصیت نے اندھیری رات کی سی کیفیت پیدا نہیں کی ہے۔ بل کے اس فضا کو پیدا کیا ہے جو سسکتی ہوئی شام کے دھند لکے میں ہوتی ہے جس سے انسان گھبراتا نہیں، بیزار نہیں ہوتا۔

بل کے اس فضا میں ڈوب جاتا ہے۔ کچھ ایسا ہی حال میرؔ کی شاعری کا ہے۔ بظاہر ان کے کلام میں جہاں شگفتگی اور مسرت کی جھلک نظر آتی ہے وہاں بھی کسی نہ کسی گوشے میں درد وغم کا بسیرا ہوتا ہے۔ کسی جگہ اگر وہ سرور وانبساط اور مسرت وشادمانی کی باتیں بھی کرتے ہیں تو ان کی تہہ میں رنج والم جھانکتے نظر آتا ہے۔ ان کی بات میں حسرت ہے، ناکامی ہے۔ اُداسی ہے۔ غمگین ہے کہ اسی سے اُن کی زندگی عبارت تھی۔ ان کی ناموری کا راز اس میں ہے کہ انھوں نے شاعری کو درد اور درد کو شاعری بنادیا ہے۔ دوسرے شاعروں کہ یہاں درد تو ہوسکتا ہے۔ یا درد بھری شاعری تو ہوسکتی ہے۔ لیکن خود درد کو شاعری بنادینا سوائے میرؔ کے کسی اور کے بس کی بات نہیں۔ انھوں نے زندگی بھر شعر کے پردے میں غم سنایا ہے۔ کیوں کے ان کی زندگی اسی غم سے عبارت تھی۔ اسے لئے ان کے دل کا مرثیہ نہ صرف انھیں رولاتا ہے بل کے دوسرے بھی اس پر آنسوں بہاتے ہیں۔ ان کا دعویٰ تو صرف یہ ہے کہ انھوں نے درد وغم کو جمع کر کے دیوان بنادیا۔ ان کے قریب عشق ہی خالق، وشق ہی خلق اور عشق ہی باعثِ ایجادِ خلق ہے، اس تصور عشق پر اپنی مثنوی شعلۂ شوق، دریا عشق اور معاملاتِ عشق کے آغاز میں وضاحت سے روشنی ڈالی ہے۔ میرؔ کی شاعری کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ انھوں نے چھوٹی چھوٹی بحروں میں بڑے بڑے مضامین نظم کیئے ہیں۔ ان کے یہاں محرومی اور غمناکی کے اثرات تو سرتاپا نظر آتے ہی ہیں۔ لیکن کہیں کہیں منہ کا مزابدلنے کے لئے انھوں نے ظرافت کے پھول برسائے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

تھا میر بھی دیوانہ پر ساتھ ظرافت کے
ہم سلسلہ واروں کی زنجیر ہلا جاتا

میرؔ کہ یہاں بھدا اور ثقیل لفظ بھی ان کے ہاتھ میں پہنچ کر موم ہوجاتا ہے اور وہ جس طرح چاہتے ہیں اسے استعمال کرتے ہیں۔

میرؔ دراصل جذبات کے شاعر ہیں۔ کوئی خیال ان کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے تو وہ فوراً اسے شعر کے سانچے میں نہیں ڈھال دیتے ہیں۔ ان کی امتیازی شان یہ بھی ہے۔ کے ان کی شاعرانہ مہارت ہی کہا جاسکتا ہے۔ کوئی خیال ان کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے۔ تو فوراً اسے شعر کے سانچے میں نہیں ڈھال دیتے۔ یہ خیال ان کے دماغ میں پکتا اور پگھلتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ جذبہ واحساس کی شکل اختیار کرلیتا ہے اور آخر کار تاثیر سے لبریز ہوکر شاعری کی شکل میں نمودار ہوجاتا ہے۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق فرماتے ہیں۔

"میرؔ کے شعر چپکے چپکے خود بخود دل میں اثر کرتے چلے جاتے ہیں جس کی مثال اس نشتر کیسی ہے جس کی دھار نہایت باریک اور تیز ہے اور اس کا اثر اسی وقت معلوم ہوتا ہے جب وہ دل پر جا کر کھٹکتا ہے۔ میرؔ کا رتبہ انیس سے بھی بلند ہے کہ انیسؔ رُلاتے ہیں میر خود روتا ہے۔ یہ آپ بیتی ہے اور وہ جگ بیتی"۔

میرؔ کی شاعری کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ ہمیں پسپا نہیں کرتا، حوصلہ بڑھاتا ہے اور حالات کا مقابلہ کرنے کی طاقت عطا کرتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ لفظوں کے ذریعے تصویر

بنانا یعنی پیکر تراشی کلام میرؔ کا خاص وصف ہے۔بلاشبہ وہ اردو شاعری کے خدائے سخن ہیں۔غالبؔ فرماتیں ہیں۔

ریختے کے تمھیں استاد نہیں ہو غالبؔ
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

اور اس میں شک نہیں کہ اپنے زمانے سے لے کر ہمارے زمانے تک اردو غزل کی دنیا پر میرؔ ہی چھائے ہوئے ہیں۔اس کہ متعلق آئی۔اے رچرڈز کا قول ہے کہ کوئی فن پارہ اپنی تخلیق کے سو سال بعد تک زندہ رہے تو یہ اس کی عظمت کی دلیل ہے،دوصدی سے زیادہ عرصہ گزرجانے کے باوجود میر کی غزل آج بھی تروتازہ ہے بل کے اس کی کشش میں کچھ اور اضافہ ہوگیا ہے میرؔ کی عظمت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے۔بل کے یہاں تک کہتے ہیں کہ:۔

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا

نیاز جیراج پوری

نظم گُجرات ۲۰۰۲ء (موجودہ دور کے تناظر میں)

گھرے ہوتے سُرخ سائے سَر زمینِ ہند پر فِتنہ فساد اور شور و شَر کے باعثِ تشویش ہیں
نام پر مذہب دھرم کے قتل اور غارت گری، آتش زنی، یہ بلوے دنگے باعثِ تشویش ہیں
اُف! اہنسا کے پُجاری باپُو کے گُجرات میں کھیل ایسا اِن حیوانوں نے یہ کھیلا ہے کہ ہائے ہائے
جانے کِتنے گھر دُوکاں اور کارخانے نذرِ آتش ہو گئے جو اُنکے مَلبے باعثِ تشویش ہیں
گلیوں میں، سڑکوں پہ، چوراہوں پہ بوئیں نفرتوں کے بیج جو وہ سَر پھر سب دیش دُشمن ہی تو ہیں
شعلۂ فِرقہ پرستی ایکتا کے باغ میں بھڑکائیں جو اُنکے اِرادے باعثِ تشویش ہیں
بے گُناہوں اور معصوموں کو بے خوف وخطر جو قتل کرتے اور جلاتے پھر رہے ہیں زعم میں
حوصلہ ان کا پسِ پردہ بڑھانے والے یہ اہلِ سیاست کے اِشارے باعثِ تشویش ہیں
کون ذہن و دِل کے کالوں سے کہے کہ خون ہندو اور مُسلِم تو ہُوا کرتا نہیں اے وحشیو!
تُم تو مریادہ پُرشوتّم رامؔ جی کے نام پر جو کرتے ہو وہ کارنامے باعثِ تشویش ہیں
ایکتا اَن ایکتا میں پیار سے پیارے وطن ہندوستاں کی شان اور پہچان جوتھی صدیوں سے
مسخ کرتے اور بدلتے رہتے اس پہچان کو جو اُنکے کالے کارنامے باعثِ تشویش ہیں
کہہ رہی تھیں چیخ کر لاشیں مُحافِظ اور مسیحا سَر پھرے ان قاتلوں کے ہم خیال اور ساتھ تھے
عملی جامہ سازشِ دیرینہ اور منصوبوں کو پہنانے والے جن کے نعرے باعثِ تشویش ہیں
ننگا ناچ حیوانیت کا کرنے والے یہ درندے آئیں و قانون کو بھی ٹھوکروں میں رکھتے ہیں
زعم میں جو بار بار اِنسانیت کو کر گئے تاراج وہ شیطان زادے باعثِ تشویش ہیں
حیف! ہوتے جارہے ہیں غیر اپنے بھی یہاں پر، قومی یکجہتی کی کوشش کرنے والے کیا ہُوئے
نفرت وتفریق کی آندھی میں دُھندلے ہوتے مٹتے نقش روشن ایکتا کے باعثِ تشویش ہیں
اے نیازؔ آواز دیں اہلِ وطن کو آگے آئیں، کُچھ کریں کہ جگ ہنسائی ہو رہی ہے دیش کی
کھینچ کر فِرقہ پرستوں، شَر پسندوں کو لے آئیں اور کُچل دیں جنکے فِتنے باعثِ تشویش ہیں

مدرسہ اسلامیہ نجم العلوم (اقامتی وغیر اقامتی ادارہ)

شاہی ہلز شاہین نگر حیدرآباد

زیر انتظام: شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد

Ac No: 1327104000065876 Bank Name: IDBI
AcN: SHIBLI INTERNATIONAL ADUCATIONAL AND CHARITABLE TRUST
IFS: IBkL0001327. Branch: Charminar Hyderabad (T.S)

بانی وناظم: مولانا ڈاکٹر مفتی محمد محامد ہلال اعظمی۔موبائل: 9392533661

منظور حسن گدا۔ ریسرچ اسکالر مانو یونیورسیٹی شعبۂ فارسی

مولانا خاموش کریری رباعیات کے آئینے میں

سید عبدالجبار خاموش کریری بیسوی صدی عیسوی کے فارسی شعراء میں شمار کیے جاتے ہیں۔آپ کا اصلی نام سید عبدالجبار اور تخلص خاموش استعمال کرتے تھے۔آپ ۱۹۱۲ء بمطابق ۱۳۳۰ھ میں شمالی کشمیر کریری میں پیدا ہوئے۔آپ اپنی ولادت کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں۔

مہمان چند روزم در دیر بی قراری
دنیا دون ندارد اکنون پایداری
سال ولادت خود کردم رقم بہ تحقیق
یعنی ز خاطر خوش جبار شاہ بخاری

آپ کے والد محترم کا نام سید غلام شاہ بخاری اور آپ کی ماں کا نام سیدہ مہرالنسا بیگم ہے۔آپ نے اپنی سوانح خود لکھی ہے اور آپ کے آثار سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کے جد کا نام سید عزیز اللہ بن شرق ہے۔آپ نے اپنی ابتدائی تعلیم اپنے والد محترم سے ہی حاصل کی۔قرآن کی تعلیم کے علاوہ آپ کو فارسی اور عربی میں بھی مکمل دسترس تھی۔آپ نے سید عنایت اللہ بخاری سے فارسی زبان کا علم حاصل کیا۔آپ بیس سال کی عمر میں سلسلۂ کبروی میں داخل ہوئے اور غلام محمد شاہ کے دست مبارک پر بیعت کی۔ آپ نے اپنے موت سے ایک سال قبل اپنی موت کی بشارت دی تھی۔

دار دنیا فانی است ای نیک خو
تا توانائی دل منہ ہر گز بدو
قبلۂ من شاہ محمد از عزیز
از خلیل اللہ ہمین فرزند او
سال نقل من کسی گر پرسیدت
وای کش پس جنتی خاموش گو
(۱۳۹۳)

سید عبدالجبار خاموش کریری صوفی منش، عالم دین، متقی، پرہیزگار ہونے کے ساتھ ساتھ بلند پایہ ادیب اور شاعر تھے۔انہوں نے فارسی زبان کے علاوہ کشمیری اور اردو زبان میں بھی کامیاب شاعری کی ہے۔شاعری کی تقریباً تمام اصناف سخن میں غزل، مثنوی، مرثیہ، رباعی اور شہرآشوب میں طبع آزمائی کی ہے۔انہوں نے تینوں زبانوں میں تقریباً ۲۱ سے زائد تصانیف جن میں نثر و نظم شامل ہیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔

جیسا کہ ذکر ہوا خاموش نے مختلف اصناف شعر میں خامہ فرسائی کی ہے جن میں رباعی بھی انکی محبوب صنف سخن رہی ہے۔ان کی فارسی رباعیات کی تعداد بہت کم ہے جو عبارت کے لحاظ سے بہت ہی سادہ ہیں لیکن معنی کے لحاظ سے سنگین ہیں۔انکی رباعیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خاموش کا دل بعض باتوں سے بہت متاثر تھا جیسا کہ موصوف کی نظر میں زمانے کی گردش کی شکایت، عمر کی بے مقداری اور ناپایداری، دنیا کے معمے انسان کے بس کے نہیں بلکہ ایک اچھے اور متقی انسان کیلئے یہ قید خانہ ہے۔ اپنی رباعی میں ایک جگہ یوں کہتے ہیں ۔

ندانم چرخ را با من چہ کینہ است
کہ ہر دم بر من اندر کمین است
بحیرت بودم و ہاتف ندارد
کہ دنیا قید و بند مومنین است[1]

چونکہ خاموش ایک حب الوطن شاعر بھی تھے۔ان سے اپنے وطن کی بدحالی نہیں دیکھی جا سکتی۔وہ وطن کی خوشحالی میں خوشحال اور بدحالی میں بدحال رہتے تھے۔ریاکاروں اور فتنہ پرور لوگوں کی حرکات و سکنات سے ان کا دل جلتا تھا۔وہ اپنے گاؤں میں علم کی شمع کو بجھتے ہوئی نہیں دیکھنا چاہتے۔بلکہ اسے روشن دیکھنا چاہتے ہیں۔ان کی شاعری میں اس طرح کے احساسات و جذبات نمایاں طور پر دیکھنے کو ملتے ہیں۔نمونے کے طور پر ان کی ایک رباعی پیش کی جاتی ہے۔

زکریری نور دانش ختم شد اکنون سیاہ رنگ است
عجب دردی است اندر دل اگر گویم ہمان جنگ است
عجایب بلبلان زاگ و زغن نازان روند در باغ
چنان قحط شان شد کہ یکسان گوہر و سنگ است[2]

متذکرہ خاموش کے کلام سے پتہ چلتا ہے کہ ان سے اپنے گاؤں کریری کی بدحالی اور تعلیم و تربیت میں موروثی اثرات ختم ہونے پر دل کے اندر عجیب و غریب درد محسوس ہو رہا ہے۔شاعر بہت رنجیدہ نظر آرہے ہیں۔

ایک طرف سے شاعر اپنے اردگرد ماحول سے غمزدہ نظر آرہے ہیں تو دوسری طرف سے وہ سماج مین رہنے کا شعور عطا کرتا ہے۔ انہوں نے اپنے ماحول اور معاشرے میں رہنے کیلئے ایک تدبیر پیش کی ہے ۔انکی نظر میں ذلت ورسوائی، غم واندوہ اور جہالت کی سوچ انسان کی بے ہنری، بے محنتی اور کاہلی، سستی اور غفلت ولاپروائی سے ہوتی ہے جبکہ اس کے برعکس محنت کشی، ہوش مندی اور جدوجہد انسان کو کامیابی سے انسان کو ہمکنار کرتا ہے۔جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں ۔

بجز محنت نیابد ہیچ کس گنج
بمیزان فراست این سخن سنج
کہالت را پریشانی است لازم
بیند از دجات از شش و پنج ۳

ایک اور جگہ یوں فرماتے ہیں۔

وقار از کار کن کار
نباشد ہیچ کس بی کار را یار
ہر آن کو کاہلی را پیشہ سازد
برو دایم بود زنگاہ ادبار ۴

مزید کہتے ہیں۔

گلاب از بوی خود یابد خریدار
زبد روئی ذلیل و خوار شد خار
عزیز است آنکہ باشد صاحب ہوش
ذلیل است آنکہ دارد جہل پندار ۵

خاموش کریری کو فن رباعی پر ایک کامیاب دسترس حاصل تھی ۔کشمیر کے ایک مشہور شاعر غلام رسول نازکی اس کے توصیف میں یوں رقم طراز ہیں:

''رباعی اصناف سخن میں سے مشکل ترین صنف ہے کیونکہ چار ہی مصرعوں میں ایک پورے مضمون کو سمو دینا آسان کام نہیں ہوتا۔ اسکے اپنے انداز میں جب تک فن پر پورا عبور نہ ہو رباعی دلپذیر نہیں بنتی۔ علامہ خاموش کریری صاحب ایک خاص انداز کے مالک ہیں اور انکی سوچ کا دھارا بھی ایک خاص نہج پر چل رہی ہے''۶

خاموش کریری کی رباعیات کے بعض مصرے خالص عربی میں ہیں۔ پھر بھی سلاست وفصاحت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ان کی ایک رباعی پیش کی جاتی ہے جو اس دعوے کی بہترین شاہد ہے۔

ہر کہ صادق می بود اندر طلب
ہر چہ خواہد روز را یابد بہ شب
بوالہوس ہرگز نہ گردد کامیاب
لیس اللانسان الا نکتہ یاب ۷

خاموش نے رباعیات کی صنف کو کشمیر میں جلا بخشی۔ان کی رباعیات میں پند ونصایح کا ایک خزانہ چھپا ہوا ہے۔ جہاں اکثر انسان اپنی غفلت اور لاعلمی سے نیک و بد، گناہ وثواب، بلندی وپستی اور اپنے اعمال کا ذمہ دار خداوند کریم کو ٹھہراتا ہے وہی یہ بلند پایہ شاعر تساہلی کی نیند سے بیدار اور آغاز زندگی سے ہی فرمودات اللہ تعالیٰ پر عمل کرنے کی طرح راغب کرتا ہے جو بظاہر طور ایک عام بات ہے اور شعر کے قالب میں بندھی ہوئی نظر آتی ہے اگر غور وفکر سے دیکھا جائے تو پوری زندگی کا عکس اس میں نظر آئے گا۔دوسرے الفاظ میں ان کا کلام پڑھنے سے عقل ودانش کے دریچے کھلنے لگتے ہیں۔چند رباعیات اس ضمن میں پیش کی جاتی ہیں ۔

چون اندر کودکی باشی بہ پستی
جوان باشی رسی در حرمتی
چون پیری آیدت بینی سستی
پس ای غافل خدا را کی پرستی ۸

مزید فرماتے ہیں۔

خدا بندہ را در کلام قدیم
اقیمو الصلوٰۃ ہفت صد بار گفت
ہر آن کو تساہل کند در نماز
نشیمن دردرون سفر یافت مفت ۹
اخوت مساوات و احساس ہم
بود ہر سہ درشہر ای محتشم
عداوت حسد کینہ دزدی نفاق
ہمہ بر جبین دہات است رقم ۱۰

دراصل ایمان کی اسی بلندی سے خاموش پند ونصیحت آمیز اشعار پیش کرتے ہیں کہ انسان کو زندگی کے بعض پہلو روشن ہو جاتے ہیں۔ان کے اکثر مجموعہ اشعار میں باغ وچمن، گل وبلبل کے بجائے اخلاقی وروحانی مضامین مل جاتے ہیں۔

شاعر موصوف کی ایک اور خاصیت یہ بھی ہے کہ انہیں داماد رسول اکرم ﷺ، پدر حسنینؑ امام علیؑ سے دلی وابستگی تھی چنانچہ حضرتؑ کی شان میں علامہ خاموش اپنے علم وفن کا ادراک اور عشق ومحبت کا اظہار و اقرار رباعی کے قالب میں یوں بیان کرتے ہیں۔

بای بسم اللہ نبیؐ و نقطہ آن علیؑ
راہ نمای خویش با من گفت از روشن دلی

شان حیدر فہم کن خاموش تا آگہ شوی
از رموز باب شہر علم وحلم آن ولی[۱۱]

موصوف صوفی منش عابد تھے۔ان کے کلام میں شگفتہ اور شیرین الفاظ پائے جاتے ہیں۔ان کے اندر ایمان کی حرارت اور ایک وجدانی کیفیت تھی۔ چاہے انکی رباعی کا ذکر کریں یا پھر ان کا نعتیہ کلام کا تذکرہ کریں، دونوں صورتوں میں عاجزانہ اور انکسارانہ اعتدالانہ ملتا ہے۔ عاشق رسولؐ وآل رسولؐ اپنے حقیقی معشوق سے یوں دست بدعا ہیں ؎

ای ما جور عرب و عجم نیم نگاہی
بر حال من موی سفید روی سیاہی
افسوس کہ شد عمر عزیزم بملاہی
گمراہ شدم بہر حق بنا کنون راہی[۱۲]

مختصراً خاموش کریری نے فارسی شاعری میں اگرچہ روایتی شاعری کے طرز کو ہی اختیار کیا اور اپنا کوئی نیا پن اس میں نہ دکھا سکے تاہم ان کے موزون خیالات اور علامات واشارات کا استعمال بے حد دلکش اور دوان ہے۔ عصر حاصر میں جہاں اکثر شعراء ودانشور انگریزی زبان کی طرف راغب ہیں وہیں یہ شاعر فارسی زبان سے والہانہ عشق ومحبت کا اظہار کرتے ہوئے نظر آرہے ہیں۔ جو کہ قابل داد ہے۔انہوں نے نہ صرف رباعی کی صنف میں ہی اپنے تجربات واحساسات کا اظہار کیا ہے بلکہ فارسی زبان کی گوناگوں اقسام شعر میں اپنے جزبات واحساست کا اظہار کیا ہے جس سے وابستگان علم وادب کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ آپ کے کلام سے چند ایسی رباعیات کا انتخاب کیا گیا ہے جو مختلف موضوعات زندگی سے ہمیں متعارف کراتے ہیں۔ ساتھ ہی ان کے مطالعے سے عبرت حاصل ہوتی ہے۔

چہ خوش بودی اگر عمر را آواز پا بودی
کہ انسان رفتنش دیدی و یک لحظہ نیاسودی
بلہ این زندگی چون شمع در سوز و گداز است آہ
صدای سوزش این را کسی ای کاش بشنیدی[۱۳]

ای دل تو شکستہ باش وخاموش
در یاد حق مست باش و مخروش
کہ سبوی درست بدست گیرند
اشکستہ سبو برند بر دوش[۱۴]

زندگانی خوش بخواہی از تکلف دور باش
وز تعلق بگذر ووقت اجل مسرور باش
موت وجہ شادی وہم باعث آزادی است
ہمچو پروانہ ولی خاموش محو نور باش[۱۵]

منابع

۱۔قلمی نسخہ بیاض خاموش، باترتیب غیر مطبوعہ ص ۱۹۵ (۲) ایضاً ص ۱۹۵ (۳) رباعیات خاموش حصہ سوم سال اشاعت ۲۰۱۴ مطبوعہ الطاف اسٹیڈیو، مرادآباد کریری ص ۲۳۰ (۴) ایضاً ص ۲۳۰ (۵) ایضاً ص ۲۳۰ (۶) سہ ماہی ادبی جریدہ ماہ نامہ الارشاد، سال ماہ صفر ۱۳۸۳ھ ص ۱۶ (۷) رباعیات خاموش متذکرہ ص ۲۴۱ (۸) ایضاً ص ۲۲۹ (۹) ایضاً ص ۲۳۲ (۱۰) ایضاً ص ۲۳۲ (۱۱) ایضاً ص ۲۳۷ (۱۲) قلمی نسخہ، بیاض خاموش، باترتیب، غیر مطبوعہ، ص ۸۱ (۱۳) رباعیات خاموش ص ۲۴۳ (۱۴) ایضاً ص ۲۴۳ (۱۵) ایضاً ص ۲۴۱

DR. S.J HUSSAIN
MD (Unani)
Former director Incharge
Central Research Institute Of Unani Medicine
Govt of India

website: www.unanicentre.com
Email:syedjalilhussain@gmail.com
jaleel_hussain@yahoo.com

Dr. Jaleel's

یونانی سینٹر فار کارڈیک کیر
UNANI CENTER FOR CARDIAC CARE

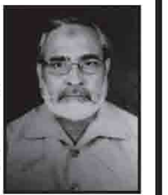

Consultation Time
Morning:11:00 am to 2:30 pm-Evening:7:00 pm to 9:30 pm
(Friday Morning and Sunday Evening Closed)

Cell:
+91 8142258088
+91 7093005707

Adress -: No: 8-1-332/3/B-69, RoadNo 1(A)Arvind Nagar Colony
Tolichowki Hyderabad - 500008 T.S India

احمد نور عینی۔ پی ایچ ڈی اسکالر عثمانیہ یونیورسٹی

سی اے اے، این پی آر اور این آر سی حقائق، خطرات، لائحۂ عمل

(سوال و جواب کی شکل میں)

☆سوال: سی اے اے کیا ہے؟

جواب: سیٹیزن شپ امینڈمنٹ ایکٹ (Citizenship Amendment Act) کا مخفف ہے، یہ 1955 میں بنائے گئے شہریت قانون میں پانچویں ترمیم ہے، اس کے تحت افغانستان، پاکستان اور بنگلہ دیش سے آئے ہوئے ہندو، سکھ، بدھسٹ، جین، پارسی اور عیسائی، جو 31 دسمبر 2014 سے پہلے بھارت میں داخل ہو چکے وہ غیر قانونی درانداز قرار نہیں پائیں گے؛ بل کہ انھیں بھارت کی شہریت دے دی جائے گی۔

☆سوال: این آر سی کیا ہے؟

جواب: نیشنل رجسٹر آف سیٹیزنس (National Register of Citizens) کا مخفف ہے۔ یہ ایک سرکاری رجسٹر ہے جو ان لوگوں کا نام درج کرنے کے لیے بنایا گیا ہے جو دستاویزی طور پر اپنی شہریت ثابت کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔

☆سوال: این پی آر کیا ہے؟

جواب: نیشنل پاپولیشن رجسٹر (National Population Register) کا مخفف ہے، یہ ایک سرکاری رجسٹر ہے جو آبادی کی مردم شماری کے لیے بنایا گیا ہے، مگر اس کا مقصد بھی وہی ہے جو این آر سی کا ہے۔

☆سوال: این پی آر ہی این آر سی کیسے ہے؟

جواب: درج ذیل وجوہ کی بنیاد پر این پی آر کو این آر سی کا چور دروازہ کہا جا سکتا ہے:

وزارت داخلہ کی طرف سے شائع سالانہ رپورٹ (2018-19) کے صفحہ 262 پر لکھا ہوا ہے کہ این پی آر در اصل این آر سی کا پہلا قدم ہے۔

آسام میں این آر سی ہو گئی اس لیے وہاں این پی آر نہیں ہوگا، اس کا صاف مطلب ہے کہ این پی آر ہی این آر سی ہے۔

شہریت قانون کے 2003 کی ترمیم میں یہ بات واضح ہے کہ زبانی معلومات حاصل کرنے کے بعد مشتبہ افراد سے دستاویزات کا مطالبہ کیا جائے گا، ورنہ شہریت نہیں دی جائے گی، افراد کو مشتبہ قرار دینے کا حق سرکاری افسران کے اختیار میں ہوگا۔ یعنی این پی آر کی معلومات کو این آر سی کے لیے استعمال کیا جائے گا

این پی آر کے حالیہ فارم میں ایسی معلومات بھی لی جا رہی ہیں جو این آر سی کے لیے لی جا سکتی ہیں، اور مردم شماری کے لیے اب تک نہیں لی گئیں، مثلاً والدین کی جائے پیدائش اور تاریخ پیدائش، وغیرہ۔

☆سوال: کہا جا رہا ہے کہ این پی آر میں کاغذات نہیں مانگے جائیں گے اس لیے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔

جواب: یہ لوگوں کو گمراہ کیا جا رہا ہے، اگر این پی آر کی کرونولوجی سمجھ لی جائے تو پھر یہ بات واضح طور پر سمجھ میں آ جاتی ہے کہ کس طرح بتدریج کاغذات میں لوگوں کو پھنسایا جائے گا اور این پی آر کے ذریعہ کس طرح این آر سی کا کام کیا جائے گا۔ کرونولوجی یوں ہے:

سب سے پہلے معلومات حاصل کرنے کے لیے سرکاری کارکنان آئیں گے، اور فارم بھر کر یا بھروا کر لے کر چلے جائیں گے، اس مرحلہ میں کسی طرح کا کاغذ نہیں مانگا جائے گا۔

سب کی معلومات حاصل کرنے کے بعد تحصیل دار کے دفتر میں فارم میں دی گئی معلومات کا جائزہ لیا جائے گا۔ جس فارم پر شک ہوگا اس پر D لکھ دیا جائے گا، یعنی Doubtful citizen (مشتبہ شہری) قرار دیا جائے گا۔

جن لوگوں کے فارم پر ڈی لکھا ہوا ہوگا ان سے دستاویزات طلب کیے جائیں گے۔

دستاویزات مطلوبہ معیار پر نہ اترنے کی صورت میں عدالتی چارہ جوئی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

عدالتی چارہ جوئی میں کامیابی نہ ملنے کی صورت میں ڈیٹینشن میں ڈال دیا جائے گا۔

☆سوال: سی اے اے، این آر سی و این پی آر کے نقصانات وخطرات کیا ہیں؟

جواب: اس مثلث قانون کے درج ذیل نقصانات وخطرات ہیں:

یہ دستور کی دفعہ 14 کے خلاف ہے، کیوں کہ دفعہ 14 مذہب کی بنیاد پر تقسیم کی اجازت نہیں دیتی، لہذا یہ قانون دستور کو کمزور کرنے کی کوشش ہے۔

یہ اس دیش کی بڑی آبادی کو دو نمبر کا شہری بنانے کی تیاری ہے۔

اس کی وجہ سے دیش کی ایک بڑی تعداد ڈیٹنشن کیمپ میں جانے پر مجبور ہوگی۔

ایس سی، ایس ٹی، او بی سی کے تحفظات چھین لیے جائیں گے۔

دیش کے اصل باشندوں (مول نیواسی) کو غیر ملکی تارکین وطن کا سرٹیفکیٹ دے کر انھیں سی اے اے کے تحت شہریت دی جائے گی۔

سی اے اے کے ذریعہ شہریت حاصل کرنے کے لالچ میں ایک بڑی تعداد وہ مذہب قبول کرلے گی جس پر سرکار زیادہ مہربان ہوگی۔

کاغذات بنوانے یا صحیح کروانے کے لیے رشوت کا بازار گرم ہوگا، مالدار لوگ اپنا کام بنالیں گے، غریب لوگ دھکے کھاتے پھریں گے۔

دیش کے تمام باشندوں کو اپنا کام دھندا سب کچھ چھوڑ کر لائن میں لگنا ہوگا۔

اس سے ملک سنگین معاشی بحران کا شکار ہوگا۔

مسلمانوں کی شہریت چھین کر یا دوسرے نمبر کا شہری بنا کر وقف جائدادیں ضبط کرلی جائیں گی۔

یہ دراصل منوواد لانے اور منوسمرتی نافذ کرنے کی تیاری ہے، منوسمرتی جب نافذ ہوگی تو ایس سی، ایس ٹی، او بی سی اور مذہبی اقلیتوں (Religious Minorities) کو شودر بنالیا جائے گا اور بہ تدریج ان سے حق ملکیت، حق تعلیم، حق ملازمت، حق رائے دہی اور حق انتخاب وغیرہ چھین لیے جائیں گے۔

☆سوال: ہمیں کیا کرنا ہوگا؟

جواب: ہم عہد کریں کہ

ہم کاغذ نہیں دکھائیں گے۔

ہم این پی آر میں اپنی تفصیلات نہیں بتائیں گے۔

ہم سول نافرمانی کے لیے تیار رہیں گے۔

ہم قوم کو دھوکہ نہیں دیں گے۔

☆سوال: اس کا حل کیا ہے؟

جواب: اس کا واحد حل بائیکاٹ ہے۔

☆سوال: کیا کاغذ درست کرالینا اس کا حل نہیں ہے؟

جواب: نہیں، کاغذ درست کرالینا اس مسئلہ کا حل نہیں ہے۔

☆سوال: تو کیا کاغذات درست نہیں کرانے چاہئیں؟

کاغذ درست کرا لینے سے کسی کو انکار نہیں ہے اور نہ ہی کسی نے منع کیا ہے، کاغذات ہمیشہ درست رہنے چاہئیں، این آر سی نہ بھی ہو تو بھی کاغذات درست کرالینے چاہئیں اور ہمارے پاس ضرورت کے کاغذات درست حالت میں موجود ہونے چاہئیں، مگر کاغذ اس مسئلہ کا حل نہیں ہے۔

☆سوال: کاغذ مسئلہ کا حل کیوں نہیں ہے؟

جواب: اس لیے کہ

۔مسئلہ کاغذ کی خرابی کا نہیں ہے، نیت کی خرابی کا ہے۔

۔جو کاغذات عام طور پر لوگوں کے پاس موجود رہتے ہیں یعنی آدھار کارڈ، ووٹر آئی ڈی کارڈ، راشن کارڈ وغیرہ ان کا این آر سی کے لیے کوئی اعتبار نہیں ہے۔

این آر سی کے لیے زمین کے کاغذات مانگے جارہے ہیں، جب کہ زمینی صورتحال یہ ہے کہ کروڑوں کی تعداد میں لوگوں کے پاس زمین نہیں ہے، اگر زمین ہے تو کاغذات نہیں ہے، اگر کاغذات ہیں تو مطلوبہ زمانے کے نہیں ہیں، اگر مطلوبہ زمانے کے ہیں تو قابل اصلاح ہیں۔ ایسے لوگوں کی تعداد نسبتاً کم ہے جن کے پاس مطلوبہ کاغذات قابل قبول صورت میں موجود ہیں۔

۔اس کی کیا ضمانت ہے کہ کاغذات جمع کرانے کے بعد ہمارا نام این آر سی سے خارج نہیں ہوگا، جب آسام کی سابق وزیر اعلی انورہ تیمور، کارگل فوجی محمد ثناء اللہ اور سابق صدر جمہوریہ جناب فخر الدین صاحب کے گھر والے این آر سی سے باہر ہو سکتے ہیں تو عوام کس شمار میں؟؟؟

۔مان لیجیے کہ سارے کاغذات صحیح نکل گئے اور شہریت بھی مل گئی تو بھی سنگھ جس منوواد کو لانے کے لیے بے چین ہے وہ جب آئے گا تو ان تمام مسلموں اور ایس سی ایس ٹی او بی سی کے لوگوں کو دوسرے نمبر کی شہریت دے دی جائے گی جن کو کاغذات صحیح ہونے کی وجہ سے این آر سی میں شہریت ملی تھی۔

۔سنگھ وادی حکومت نے اپنے مقصد کے لیے جو منصوبہ بندی کی ہے اسے وہ حاصل کر کے رہے گی، چاہے جتنے بھی کاغذات بنالیے جائیں۔

☆سوال: سنگھ وادی حکومت کی کیا منصوبہ بندی ہے؟

جواب: سنگھ واد و منوواد حکومت اپنے ہدف تک پہنچنے کے لیے درج ذیل طریقہ کار اختیار کرسکتی ہے:

۔ایک بڑی آبادی کو ڈیٹنشن کیمپ بھیجا جائے۔

۔ایک بڑی تعداد کو غیر ملکی پناہ گزین کا سرٹیفکٹ دے دیا جائے۔

۔اچھی خاصی تعداد میں لوگوں کو شہریت نہ دے کر رہائشی

سرٹیفیکٹ دیا جائے۔
۔سیکولر ووٹرز کی بڑی تعداد کو حق رائے دہی سے محروم کر کے سیکولر ووٹ کم سے کم کر دیے جائیں۔
۔ایک بڑے طبقہ کو دوسرے نمبر کا شہری بنا دیا جائے۔
۔کمزور ایمان والے مسلمانوں کو سی اے اے کے لالچ میں مذہب تبدیل کرنے پر مجبور کیا جائے۔
۔جن کو تحفظات حاصل ہیں ان کے تحفظات لے لیے جائیں۔
۔بھارت کے اصل باشندوں (مول نیواسیوں) کو بڑی تعداد میں CAA کے ذریعہ شہریت دے کر باہری قرار دے کر دیا جائے۔
۔OBC,SC,ST کی ایک بڑی تعداد جو اپنے آپ کو ہندو نہیں کہتی انھیں دستاویزی طور پر ہندو قرار دے کر شہریت دی جائے۔
۔این آر سی سے باہر نکالے جانے اور سی اے اے کے ذریعہ اندر لائے جانے کے درمیانی وقفہ میں جائیدادیں ضبط کر لی جائیں۔
آہستہ آہستہ منوسمرتی نافذ کی جائے۔
این آر سی و این پی آر کا بائیکاٹ نہ کرنے کا مطلب مذکورہ بالا جرائم میں سنگھی حکومت کی مدد کرنا اور اسے اپنے مقصد میں کامیاب کرنا ہے۔
☆سوال: سیاہ قانون کے خلاف حکومت پر پریشر ڈالنے اور حکومت مخالف ماحول بنانے کے لیے کیا کیا جائے؟
جواب: درج ذیل صورتیں اختیار کی جائیں:
۔ہر علاقے میں شاہین باغ کی طرز پر دھرنا منظم کیا جائے۔
۔پورے دیش میں احتجاج، ریلی، مارچ، دھرنا، بھوک ہڑتال، انسانی زنجیر اور احتجاجی جلسوں ومشاعروں کا ماحول گرم رکھا جائے۔
۔مختلف یونینس اور تنظیموں کے ساتھ مل کر کسی دن متحدہ بند کی اپیل کی جائے۔
۔علاقے کے ایم ایل اے اور ایم پی کے گھروں کا اگر ممکن ہو تو گھیراو کیا جائے اور اس سے کہا جائے کہ یا تو وہ اپنی پارٹی کے ذمہ دار کو سیاہ قانون کے خلاف موقف اختیار کرنے میں کامیابی حاصل کرے یا استعفی دے۔
۔اپنے اپنے صوبوں کے وزیر اعلی سے اس سیاہ قانون کے خلاف قرارداد پاس کرنے کا مطالبہ کیا جائے، اور اس کے لیے ہر ممکن صورت اختیار کی جائے۔

☆سوال: رائے عامہ ہموار کرنے اور بائیکاٹ کو منظم کرنے کے لیے لائحۂ عمل کیا ہے؟
جواب: درج ذیل باتوں پر عمل کیا جائے:
۔ہر صوبہ میں جوائنٹ ایکشن کمیٹی بنائی جائے اور اگر پہلے سے بنی ہوئی ہو تو اس میں شامل ہو کر کام کیا جائے۔
۔محلہ وار کارکنوں ورضا کاروں کی جماعت بنائی جائے۔
۔محلہ کے تمام گھروں کے ذمہ دار افراد کے نام مع فون نمبرات ایک رجسٹر میں امانت داری کے ساتھ لکھ لیے جائیں۔
۔گھر گھر پہنچ کر ملاقات کی جائے۔
۔ہر علاقہ میں بستی سبھا یا نکڑ سبھا کا اہتمام کیا جائے۔
۔مساجد میں جمعہ کے روز اس پر گفتگو کی جائے اور نماز کے بعد سب سے عہد لیا جائے۔
۔آٹو یا رکشے میں گلی گلی گھوم کر قانون کی سنگینی سے آگاہ کیا جائے اور بائیکاٹ کی اپیل کی جائے۔
۔علاقہ کے کسی میدان میں یا کسی بڑے ہال میں سب کو جمع کر کے اس مسئلہ پر حکومت کے ساتھ تعاون نہ کرنے کا عہد لیا جائے۔
۔محلہ وار نوجوانوں کی ایک ٹیم تیار کی جائے جو ہنگامی حالات میں کام آسکے۔
۔محلہ وار یہ اعلان کیا جائے اور دیواروں پر پوسٹر لگایا جائے کہ جو بائیکاٹ نہیں کرے گا اس کا سوشل بائیکاٹ کر دیا جائے گا۔
۔بس اسٹاپس اور چوراہوں پر ہورڈنگس اور پوسٹرس لگائے جائیں۔
۔مقامی رفاہی وملی تنظیموں سے مل کر انھیں کام میں شریک کیا جائے۔
۔غیر مسلم تنظیموں سے مل کر غیر مسلم آبادی میں کام کیا جائے۔
۔اسکولوں اور کالجوں اور دیگر تعلیم گاہوں میں شعور بیدار کیا جائے، سرپرستوں کو بلا کر اس کی سنگینی وخطرناکی سے آگاہ کیا جائے۔
۔آئی ٹی سیل بنایا جائے اور ہر علاقے میں منظم طور پر ذہن سازی وخبر رسانی کا کام شروع کیا جائے۔
۔سماج کی بااثر مسلم وغیر مسلم مذہبی وغیر مذہبی شخصیات میں سے سو سے زائد شخصیات کی مشترکہ ویڈیو ایڈیٹ کر کے وائرل کی جائے جس میں ہر شخصیت چند سیکنڈ میں صرف تین جملے پوری قوت کے ساتھ کہے کہ ''اس مسئلہ کا حل صرف بائیکاٹ ہے، میں بائیکاٹ کرتا ہوں آپ بھی

بائیکاٹ کریں'۔

۔اس سیاہ قانون کو اور منوواد کو عام فہم انداز میں سمجھانے کے لیے ڈراموں اور مکالموں کی ویڈیو کلپس بنائی جائیں۔

۔لوگوں کے اندر حوصلہ پیدا کرنے اور ان کے جذبات کو سرد ہونے سے بچانے کے لیے ترانوں اور نغموں کی ویڈیو کلپس تیار کرائی جائیں۔

۔لیگل سیل بنایا جائے جس میں وکیلوں اور قانون کے ماہروں کی خدمات حاصل کی جائیں۔

۔سماج میں اور خاص کر بہوجن و دلت سماج میں جا کر منوسمرتی کی تباہ کاریاں اور منوواد کی دہشتنا کیاں سمجھائی جائیں۔

۔یوم عہد منایا جائے اور سب سے بائیکاٹ کا عہد لیا جائے۔

۔جس دن این پی آر کے لیے حکومتی کارکنان کا آنا طے ہو اس دن سب لوگ اپنے اپنے محلہ اور گاؤں میں ایک جگہ دھرنا کے لیے بیٹھ جائیں۔

☆سوال: بائیکاٹ کے کیا نقصانات ہو سکتے ہیں؟

جواب: درج ذیل نقصانات ہو سکتے ہیں:

۔1000 روپے جرمانہ دینا پڑ سکتا ہے۔

۔پولیس حراست میں لیا جا سکتا ہے۔

۔بعض سرکاری سہولیات سے محروم بھی کیا جا سکتا ہے۔

☆سوال: بائیکاٹ نہ کرنے کے کیا نقصانات ہو سکتے ہیں؟

جواب: درج ذیل نقصانات ہو سکتے ہیں:

کاغذات کے چکر میں لوگوں کی زندگی اجیرن کر دی جائے گی۔

عدالت میں اپنی شہریت ثابت کرنے کے لیے عہدیداروں کو جائز اور ناجائز رقم دینے کے لیے گھر کے زیورات بل کہ گھر ہی بیچنے پر بہت سے لوگ مجبور ہو جائیں گے۔ جیسا کہ آسام میں لوگ ایسا کرنے پر مجبور ہوئے۔

نفسیاتی خوف کی وجہ سے کمزور دل لوگ خودکشی کر لیں گے۔

تبدیلی مذہب پر لوگ مجبور ہوں گے۔

ایک بڑی تعداد کو ڈیٹنشن سینٹر میں ڈالا جائے گا۔

ایس سی، ایس ٹی، او بی سی اور اقلیتوں (Minorities) کی ایک بہت بڑی تعداد کو حق رائے دہی سے محروم کر دیا جائے گا۔

ایک بڑی تعداد کو ان کی اپنی زمینوں اور جائدادوں سے محروم کر دیا جائے گا۔

اصل باشندوں (مول نیواسی) کو باہری قرار دے دیا جائے گا۔

بہ تدریج منوواد لایا جائے گا اور بھارت کا آئین مسترد کر کے منوسمرتی کو نافذ کیا جائیگا۔

جن لوگوں کے کاغذات صحیح ہوں گے مگر وہ سنگھ واد کے مخالف ہوں گے تو آگے چل کر انھیں دو نمبر کا شہری بنا دیا جائے گا۔

ایس سی، ایس ٹی، او بی سی اور اقلیتوں کے تحفظات کو ختم کر دیا جائے گا۔

شودر اور دلت کو بہ تدریج غلامی والی زندگی میں ڈھکیل دیا جائے گا۔

مذہب پر عمل کی آزادی ختم ہو جائے گی۔

پرسنل لاز کالعدم قرار پائیں گے۔

☆سوال: بائیکاٹ کب تک کرنا ہوگا؟

جواب: این پی آر شروع ہونے کی تاریخ سے لے کر این پی آر کی آخری تاریخ تک۔ (متوقع تاریخ: یکم اپریل تا 30 ستمبر)، اسی طرح اگر این آر سی کا عمل شروع ہوتا ہے تو این آر سی کی آخری تاریخ تک۔

☆سوال: کیا کسی تنظیم نے بائیکاٹ کرنے کی بات کہی ہے؟

جواب: بائیکاٹ کی اپیل کرنے والی تنظیموں کی فہرست کافی طویل ہے، یہاں چند کے نام لکھے جاتے ہیں: پاپولر فرنٹ آف انڈیا، بامسیف، بھیم آرمی، ہم بھارت کے لوگ (WE the People of India)، جوائنٹ ایکشن کمیٹی (دلی)، جوائنٹ ایکشن کمیٹی (حیدرآباد)، الائنس اگینسٹ سی اے اے این آر سی اینڈ این پی آر، مسلم متحدہ مجلس عمل (حیدرآباد)، آل انڈیا ملی کونسل، ونچت بہوجن اگاڈی، راشٹریہ آدی واسی ایکتا پریشد، راشٹریہ پچھڑا ورگ مورچہ۔

بقیہ: ص: ۴۰ رکا.........................

دل ہمیشہ مضطرب رہتا ہے۔ یقین جانیں انسان کے حقیقی رشتے زندگی کے کسی موڑ پر اس کا ساتھ چھوڑ جائیں تو اس سے زیادہ تکلیف دہ بات کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔ اس دکھ اور کرب کا مداوا کوئی کر ہی نہیں سکتا۔ رشتوں کی گہرائی کا احساس الفاظ سے ہی نہیں بلکہ برتاؤ اور رویہ سے ہوتا ہے۔ رشتوں کی حفاظت کریں چاہے رشتے خون کے ہوں، احساس کے ہوں یا پھر دوستی کے کیونکہ تمام رشتے انمول ہوتے ہیں۔ احساس دنیا کی سب سے خوبصورت چیز ہے۔

سیدہ تبسم منظور ناڈکر۔ممبئی

"احساس"

پانچ حروف سے بنا یہ لفظ "احساس" زبان پر آتے ہی نا جانے کتنے احساس جگا جاتا ہے۔ماں باپ کی ممتا وشفقت کا احساس، پیار ومحبت کا احساس، دکھ درد کا احساس،غم وخوشی کا احساس اور نا جانے کئی احساس دل میں پنپنے لگتے ہیں. رشتے جس سے بہت سے لوگ فوراً ہماری یادوں کے دروازے پر دستک دے جاتے ہیں۔کئی اچھے بھی ہوتے ہیں کئی برے بھی ہوتے ہیں۔ رشتے صرف خون کے ہی نہیں ہوتے بلکہ احساس کے بھی ہوتے ہیں جہاں احساس نا ہو وہاں الفاظ بھی دم توڑ دیتے ہیں۔ کسی بھی رشتے میں احساس کی اہمیت ایسے ہوتی ہے جیسے پودا لگا دیا اور اس کے لئے پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔اگر پودے کو پانی نہ دیا گیا تو وہ مرجھا جاتا ہے ایسے ہی احساس کی جگہ ہوتی ہے رشتوں میں، اگر احساس نہ ہو تو خون کے رشتے بھی مرجھا جاتے ہیں۔بعض رشتے احساس کے ہوتے ہیں الفاظ کے نہیں جو رشتے احساس کے ہوتے ہیں وہ مضبوط ہوتے ہیں۔اور احساس کے رشتے بتائے نہیں جاتے۔بس محسوس کئے جاتے ہیں۔

احساس سے محرومی دنیا کی سب سے بڑی محرومیوں میں سے ایک ہے۔کوئی منظر جیسے ظاہری آنکھ نہ دیکھ سکے اسے صرف احساس کی آنکھ سے دیکھا جا سکتا ہے۔زندگی کی اساس اصل میں احساس پر ہی قائم ہے۔ بے حسی، انسان اور انسانیت' دونوں کی دشمن ہے۔بے حس انسان دولت کو زندگی سمجھتا ہے اور زندگی کی دولت اس کے ہاتھ کبھی نہیں آتی۔آج ہمارے پاس سب کچھ ہے مگر ہمارے پاس احساس نہیں ہے۔ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی خواہش میں ہم ایک دوسرے کو روند کر آگے نکلنے کی کوشش میں لگے ہوتے ہیں۔

احساس لفظ اپنے آپ میں بہت ہی نرم اور نازک ہے زبان پر آتے ہی اپنا احساس دلاتا جاتا ہے۔جب لفظ ہی اتنا اچھا ہو تو پھر یہ جذبہ اور اس کی کیفیت کتنی پُر کیف ہوگی۔آج کے دور میں احساس کا جذبہ بہت ہی کم دیکھائی دیتا ہے۔اور جن لوگوں کے دلوں میں یہ جذبہ ہوتا ہے ان کے اپنے دل بہت نازک ہوتے ہیں۔کیونکہ جن کے دل سخت ہوں وہ اس کیفیت سے کیسے آشنا ہو سکتے ہیں۔احساس کے رشتے بنانے والے اور نبھانے والے لوگ بہت قیمتی اور حساس دل رکھنے والے ہوتے ہیں۔احساس کسی بھی رشتے میں ہو تو رشتوں کی مضبوطی میں اضافہ ہوتا ہے۔اور احساس نہ ہو تو رشتے بھی آہستہ آہستہ اپنے مقام سے ہٹ کر دوسرے رشتے بنانے لگتے ہیں۔کچھ رشتوں کا خون ہم اپنے ہی ہاتھوں سیکرتے ہیں اور کچھ اپنی مرضی سے دور ہوتے چلے جاتے ہیں۔اگر دلوں میں احساس ہو تو اجنبی بھی اپنے ہو جاتے ہیں اور اگر احساس مر چکا ہو تو اپنے بھی اجنبی بن کر رہ جاتے ہیں--زندہ ہوں وہاں ہمیشہ قائم رہتے ہیں۔احساس کے رشتے تو خوشبو کی طرح ہوتے ہیں جو ہوا کی طرح کہیں سے بھی گزر کر ہر سُو پھیل جاتے ہیں۔

انسانی معاشرے میں احساس، پیار اور محبت کی سب سے پہلی منزل ہے اگر یہ نہ ہو تو انسان میں قربانی وایثار کا جذبہ بھی کبھی پیدا نہیں ہو سکتا یا یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ احساس ختم ہو جائے تو انسانیت بھی ختم ہو جاتی ہے مر جاتی ہے۔انسان کو کسی بھی تکلیف کا احساس اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک خود کسی تکلیف سے نا گزرے۔آج ہمارے معاشرے سے تقریبا احساس کا خاتمہ ہو چکا ہے۔احساس کی چڑیا اڑ گئی ہے۔اب اس کا بسیرا لوگوں کے دلوں میں نہیں ہوتا۔کیوں کہ لوگوں کے دلوں سے احساس ہی مر چکا ہے۔ہم کسی انسان کو پریشان دیکھ

کر اس کی مدد کرنے کے بجائے اس کو چار باتیں سنا کر نکل جاتے ہیں۔ اگر راستے پر کوئی زخمی ہو کوئی مر رہا ہو تو ہم اسے اسپتال پہنچانے کے بجائے فوٹو اور ویڈیو شوٹنگ نکالنے میں لگ جاتے ہیں۔ کہاں گئے دلوں کے احساس؟ کیوں کسی کی تکلیف پر دل نہیں لرزتے؟ کیوں ہم نے اپنے دلوں کو پتھر کا بنالیا ہے؟

کئی بار کچھ احساس اتنے کھرے ہوتے ہیں کہ ہمیں ان سے اگر بدلے میں کچھ نا بھی مل رہا ہو تو بھی ان سے دور ہوا نہیں جاتا یا ہم خود دور ہونا بھی نہیں چاہتے۔ کچھ لوگوں سے ہمارا رشتہ بھی ایسا ہی ہوتا ہے ... اگر وہ ہمارے آس پاس نا بھی ہوں۔۔ .. یہاں تک کہ وہ آنکھوں سے بھی اوجھل رہیں پر ہم ایک پل کے لئے بھی ان سے دور نہیں ہو پاتے اور نا ہی ان کی یاد اور خیال سے دور ہوتے ہیں۔ پھر بھی دل میں ایک یقین ایک حوصلہ پختہ ہوتا ہے کہ بھلے وہ شخص ہماری آنکھوں سے ہماری پہنچ سے دور بھی ہے تو کیا ہوا ... وہ انسان ہماری دعاؤں کی پہنچ سے تو دور نہیں ہے اور وہ ہر لحہ اللہ تبارک وتعالی کے حصار میں ہے. رشتے بہت پیارے ہوتے ہیں آگر ہم ان کو پیارا بنانا چاہیں تو!!! رشتے احساس کے ہوتے ہیں اگر ہم سمجھنا چاہیں تو!!!!! انسانی رشتے خون کی بنیاد پر نہیں ہوتے بلکہ احساس کی بنیاد پر قائم ہوتے ہیں ہوسکتا ہے سگا بھائی اتنا دل کے قریب نہ ہو جتنا کوئی دوست احساس کرنے والا ہو۔۔ دکھ درد میں شرکت کرنے والا اور برے وقت میں کام آنے والا ہو۔ یہی سچائی ہے اور زندگی کی تلخ حقیقت بھی یہی ہے!!!! احساس سے خالی لوگوں اور پتھر میں شاید کوئی زیادہ فرق نہیں ہے۔ اپنے پیارے رشتوں کو نظر انداز کرنا بہت بڑی اذیت کا سبب بنتا ہے۔ ایسے لوگ روز جیتے ہیں روز مرتے ہیں پھر بھی انہیں سکون نہیں ملتا..............بقیہ: ص: ۳۸ / پر

جامعۃ البنات الاصلاحیۃ حیدرآباد (ملک پیٹ)

لڑکیوں کی اعلیٰ دینی وعصری تعلیم کا فکری واصلاحی معیاری مرکز

شعبہ جات: تحفیظ القرآن الکریم ★ شعبہ ابتدائیہ (دوسال) ★ شعبہ عالمیت (چار سال) ★ شعبہ فضیلت (دوسال)

☆شہر سے اہم مقامات سے آمد ورفت کی سہولت ☆ دور دراز کی طالبات کے لیے ہاسٹل کا نظم ☆ عثمانیہ یونیورسٹی سے میٹرک تا ایم۔ اے امتحانات دلوانے کا نظم

لڑکیوں کے لیے قرآن، حدیث، فقہ، ادب، سیرت، تاریخ کے علاوہ انگریزی زبان کے اعدادیہ تا فضیلت چھ سال تعلیم کا بہترین نظم ہے

رابطے کے لیے پتہ:
JAMIATUL BANAT AL-ISLAHIYAH
#16-3-993/1, NEAR DAWN HIGH SCOOL
OFFICERS COLONY, NEW MALAKPET,
HYDERABAD(T.S) INDIA 500036

نصب العین: انقلاب بذریعہ تعلیم قرآن وسنت کی گہری بصیرت، شہادت حق، احیائے دین کی استعداد اور امت کے لیے داعیانہ، مجاہدانہ اور قائدانہ کردار کی حامل "المرأۃ الصالحۃ" ٹیم کی تیاری۔

☆شعبہ تحفیظ القرآن اور شعبہ ابتدائیہ وعالمیت کے پہلے سال میں داخلے سال بھر جاری رہیں گے۔ اعلیٰ دینی تعلیم کے حصول کے خواہشمند سرپرست حضرات سے اپنی لڑکیوں کے ہمراہ جلد رجوع ہونے کی خواہش کی جاتی ہے۔

جامعۃ البنات الاصلاحیۃ حیدرآباد کا استحکام وقت کا اہم تقاضہ اور ملی فریضہ ہے۔ اس اہم مرکز کی تعمیر وترقی ک لیے مالی اور اخلاقی تعاون فرما کر ہمارے حوصلے کو قائم رکھیں۔

ناظم: مولانا عبدالعلیم اصلاحی
موبائل 9676202819

سائنسی قوس قزح

ماہنامہ صدائے شبلی میں ہر ماہ ادارے کی طرف سے کتاب پر تبصرہ کیا جائے گا،اس لئے مصنفین ،مولفین اور مرتبین سے گزارش ہے کہ وہ تبصرے کے لئے دوعدد کتابیں ضرور ارسال کریں۔(ادارہ)

مصنفین: سیدہ فاطمہ زہرہ۔و۔ڈاکٹر رفیع الدین ناصر

تبصرہ نگار: ڈاکٹر مرزا محمد خضر

صفحات: 204

قیمت: -/130 روپئے

اردو ادب میں جدید سائنسی مضامین اور تصانیف بہت کارآمد جز بن چکے ہیں۔ابھی تک ہم ناول' افسانوں اور غزلوں ونظموں کے دائروں میں محصور تھے۔لیکن اب جدید مصنفین اور مضامین نگاروں نے قدیم طلسم کو توڑ کر سائنس کی دنیا میں قدم رکھا ہے اور یہ وقت کی اہم ضرورت بھی ہے جو ہمیں روزمرہ کی زندگی کو صحت مندی کے ساتھ گذارنے کے لئے قدم قدم پر رہنمائی کرتے ہیں اور خدانخواستہ امراض نے گھیر لیا تو اس کے تدارک کے طریقے بھی بتلاتے ہیں۔عجیب نہیں کہ کمپیوٹر' انٹرنیٹ اور ٹیکنالوجی بھی ہمارے ادب میں در آئے۔

سائنس کی دنیا میں دلکش انداز میں لکھنے والوں میں جناب عبدالودود انصاری کے علاوہ دو نام اور اہم ہیں۔ایک ڈاکٹر رفیع الدین ناصر اور دوسرے سیدہ فاطمہ زہرہ (موظف پرنسپل' ڈاکٹر ذاکر حسین کالج' اورنگ آباد) ہیں۔ ڈاکٹر رفیع الدین ناصر کی 34 رکتابیں' سینکڑوں مضامین' 25 رمقالات وغیرہ قومی وبین الاقوامی سطح پر منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان تمام کتابوں کی بھارت اور بیرونِ بھارت میں شاندار پذیرائی ہوچکی ہے۔سیدہ فاطمہ زہرہ بھی ملک کے نامی گرامی سائنسی رسائل میں مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ وہ سائنسی موضوعات جو طلباء اور عام قاری کے لئے مفید ہیں' انہیں سلیقہ سے موثر انداز میں پیش کرتی ہیں۔ اس لئے اس کتاب کے بارے میں جناب عبدالودود انصاری (کولکتہ) نے اپنے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ ''ہندوستان کی تاریخ میں یہ پہلی بار ہوا ہے کہ بھائی (رفیع الدین ناصر) اور بہن (سیدہ فاطمہ زہرہ) کی مشترکہ سائنسی مضامین کا مجموعہ بنام ''سائنسی قوس قزح'' منصۂ شہود پر جلوہ افروز ہوا ہے۔میں دعویٰ کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اب تک اس طرح کا مجموعہ شاید ہی شائع ہوا ہو''۔

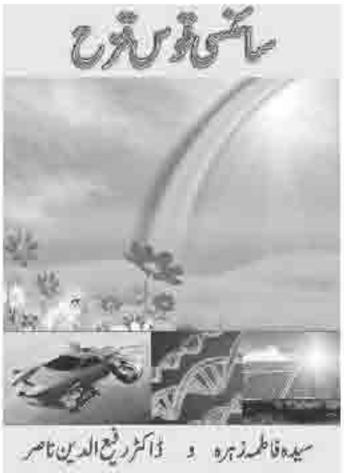

ڈاکٹر رفیع الدین ناصر اور محترمہ سیدہ فاطمہ زہرہ دونوں بھائی بہن کی مشترکہ تصنیف ''سائنسی قوس قزح'' سائنس کے اہم موضوعات پر مشتمل ہے۔قوس قزح تو سات رنگوں کو لئے افق سے کچھ اوپر چھائی رہتی ہے لیکن سائنسی قوس قزح ۳۱ راہم سائنسی موضوعات کے مختلف رنگوں کو اپنے اندر سجائے ہوئے ہے۔ پڑھتے جایئے اور مصنفین کی تخلیق کو داد و تحسین دیجئے کہ کس طرح جن سائنسی معلومات سے ہم واقفیت نہیں رکھتے تھے' انہیں سلیس اور موثر انداز میں صفحہ قرطاس پر پیش کیا گیا ہے۔

محترمہ سیدہ فاطمہ زہرہ کے پہلے پانچ ابواب جیسے جدید ٹیکنالوجی اور اردو زبان' جدید ٹیکنالوجی سے مربوط اردو

کے مسائل' اردو داں طبقہ کے تعلق سے ان کے ذہنی کرب کی عکاسی کرتے ہیں۔ تیسرا باب اسلام اور جدید سائنس میں مسلمانانِ عالم کی بے حسی پر کہہ اٹھتی ہیں "علمبردار علم و دانش نے ان سائنسی ایجادات کو اپنے نام کرلیا ہے اور ہم بے حسی و کاہلی کے کمبل میں لپٹے ان تجلیوں کو غیر کی ملکیت سمجھ کر ایک تماش بین کی طرح تالیاں بجا رہے ہیں"۔

"سائنسی ایجادات اور جدید انکشافات کا اصل ماخذ قرآن ہے اور یہ تمام ایجادات اور ترقیات مظاہر قدرت ہیں جس کی تلاش و جستجو اور فکر و تدبر کی قرآن کریم نے جگہ جگہ دعوت دی ہے"۔

قرآن الفرقان میں ۷۵٦ آیات مظاہر قدرت کے تعلق سے ہیں لیکن ہم نے کبھی ان پر تحقیقی کام نہیں کیا۔ جب سے انسان نے اس دنیا میں قدم رکھا' سائنس اس کی دامن گیر رہی۔ آگ اور پہیہ کی ایجاد سے لے کر انٹرنیٹ' جراحی کے آلات وغیرہ سب انسان کی کاوشوں کا ثمر ہے۔ لیکن ان ایجادات کی قطار میں ہم کہاں ہیں' ان مضامین میں ہمیں جگہ جگہ اس کی نشاندہی کی جاتی ہے کہ ہنوز اب تو کچھ پہل کریں۔ اسی کتاب کا چھٹا باب "نومولود بچہ اور ماں کی ذمہ داری" خواتین کی رہنمائی کے لئے نہایت اہم ہے۔ ماں کی ممتا و پیار اپنے بچے کے تعلق سے کتنا زیادہ ہوتا ہے' اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن صحیح انداز میں بچے کی پرورش کیسے ہو' جو اس کے مستقبل کے لئے کارآمد ہو' اس پر نہایت مشفقانہ انداز میں بتایا گیا ہے۔ اسی طرح دیگر ابواب بھی عام قاری کے لئے معلومات کے دریچے وا کرتے ہیں۔

ڈاکٹر رفیع الدین ناصر کے پیش کردہ مضامین میں بالاوراثیات' جدید انقلابی سائنس (Epigenetics) جدید سائنسی تحقیقات اور انسانی زندگی' انسانی نفسیات پر نباتات کے اثرات' سائنسی اور تکنیکی تعلیم' نباتات سے پلاسٹک کی تیاری' بایوٹیک فصلیں۔ ایک نعمت اور ایبولا وائرس۔ اثرات و تحفظ اردو طبقہ کے لئے نئے ہیں اور اہمیت کے حامل ہیں۔ اس کتاب کے دیگر مضامین بھی ضرورت وقت کے پیش نظر اہم ہیں۔

بالاوراثیات (Epigenetics) سائنس سے اور اس کے فوائد سے سائنس کے بھی اکثر طلباء واقف نہیں ہیں۔ دیگر شعبوں سے وابستہ لوگوں کا اس سے صحیح طرح واقف ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر صاحب نے نہایت سلجھے ہوئے انداز میں اس کو پیش کیا ہے۔ پہلے انہوں نے زندگی کی بنیادی اکائی یعنی De oxy Ribose Nucleic Acid - DNA کو سمجھایا ہے جس سے اکثر لوگ واقف نہیں ہیں۔ گو کہ اکثر اخباروں اور رسالوں میں ڈی این اے پڑھتے رہتے ہیں لیکن اس سے واقفیت نہیں رکھتے۔ ناصر صاحب نے لکھا ہے کہ یہ مرکزی ترشہ ہے جو اپنے اندر دیگر کیمیات کے ساتھ ساتھ نائٹرجنی اساسی مرکبات رکھتا ہے۔ یہ نائٹروجنی اساسی مرکبات مخصوص ترتیب سے DNA سے جڑے ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے والدین اور پھر ان کے پیش روؤں سے نسلی نسبت کے ثبوت ملتے ہیں۔ اس کا میکانزم اور فوائد اور جدید تحقیقات میں Epigenetics کے کردار پر سیر حاصل جائزہ لیا گیا۔

ڈاکٹر رفیع الدین نے اپنے دیگر مضامین جیسے صوفیانہ نظریات اور جدید سائنس میں اس بات کی وضاحت کی کہ اسلامی نظام حیات کو کس طرح آج کی سائنس قبول کر کے نئے انداز میں پیش کرتی ہے۔ انہوں نے سائنس اور تکنیکی تعلیم کی ضرورت پر بھی بہت موثر انداز میں خامہ فرسائی کی۔ چندریان ۔ ا مشن' اس طرح ماحولیات کے تحفظ میں ہماری ذمہ داریوں پر فاضل مصنف نے جنبش قلم کی ہے۔

بحر حال کتاب 'سائنسی قوس قزح' مکمل طور سے عام سائنسی معلومات کے وہ رنگ لئے ہوئے ہے جو ہماری روزمرہ کی زندگی سے جڑے ہوئے ہیں۔ اس لئے ہر ایک عام اردو قاری کے گھر میں اس کتاب کا ہونا ضروری ہے کیونکہ اس کتاب کے تمام مضامین ہمیں تخلیاتی دنیا سے نکال کر عہد حاضر کی حقیقتوں سے روشناس کراتے ہیں۔